بابا لوگ

(افسانے)

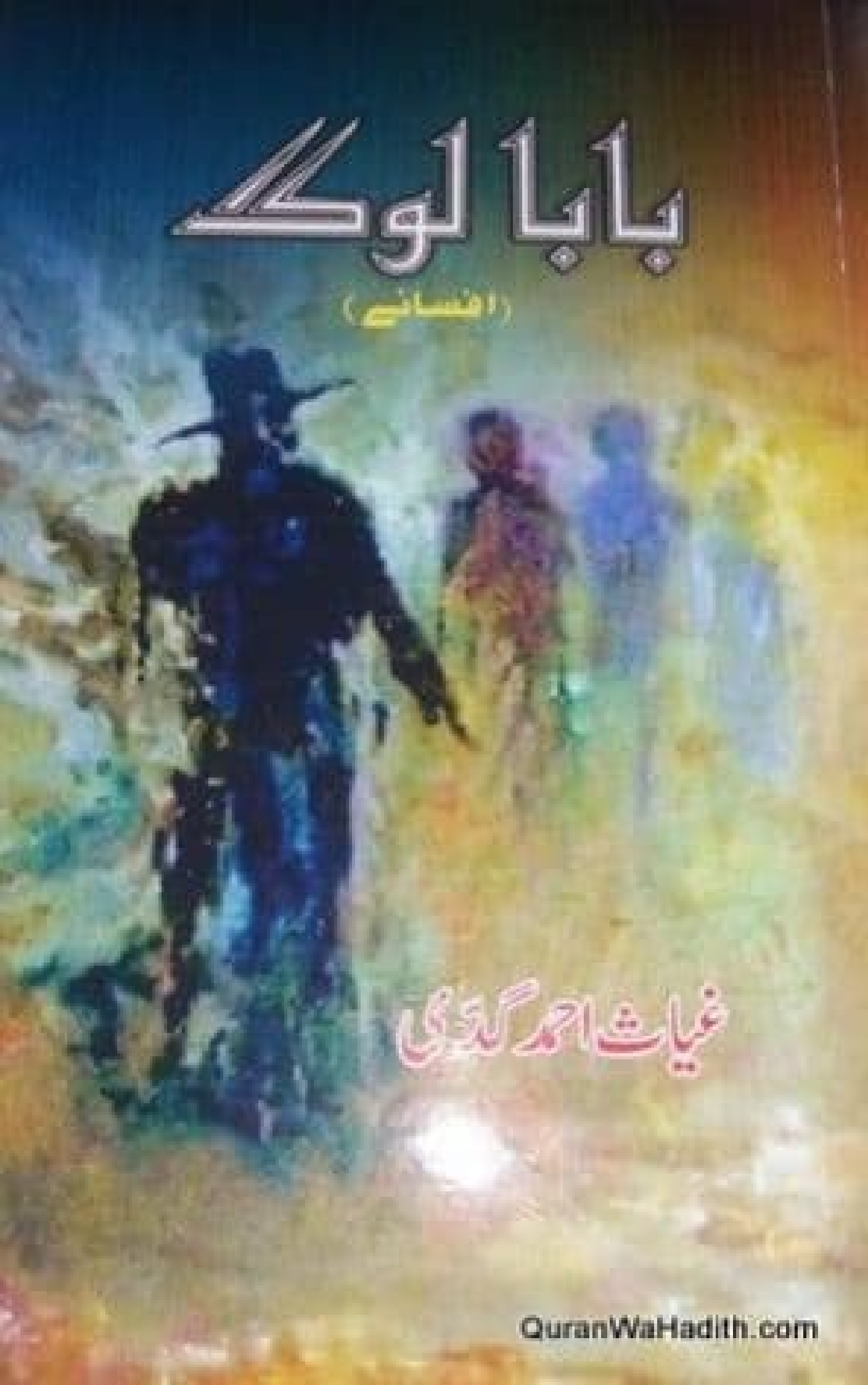

غیاث احمد گدی

QuranWaHadith.com

بابا لوگ

(افسانوی مجموعہ)

غیاث احمد گدّی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

انتساب

شفیق،

دردمند اور مسیحا نفس

شاہدہ حیدری

کے نام

○○

فہرست

☆ پیش لفظ — مناظر عاشق ہرگانوی — 7

☆ میں اُسے نہیں جانتا — کلام حیدری — 9

۱۔ بابا لوگ — 15

۲۔ پہیہ — 47

۳۔ منظر و پس منظر — 57

۴۔ بابے — 73

۵۔ ڈور تھی جون سین — 93

۶۔ بدصورت سیاہ صلیب — 105

۷۔ پیاسی چڑیا — 118

۸۔ جوہی کا پودا اور چاند — 130

۹۔ صبح کا دامن — 144

○○

پیش لفظ

غیاث احمد گدی کے افسانوں میں تخلیقی عمل بنیادی صورت حال ہے جو لاشعوری کیفیات اور فطری ردِ عمل سے تشکیل پائی ہے۔ انہوں نے اپنی ذات سے اٹھ کر آس پاس کے افراد کی زندگی، ان کے دکھ سکھ، ان کی آرزوؤں، زندہ رہنے کے لئے اور بہتر حالات کے لئے ان کی جدوجہد، ان کی کامیابیوں، ناکامیوں، انسانی اور انسانی معاشرہ، سیاست، اور معاشی الجھنوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اپنے منفرد تخلیقی لمس کے ذریعہ اثرات کو تازہ کار تخلیقی تجربہ کا روپ دینے میں بے حد کامیاب رہے ہیں۔

غیاث احمد گدی کے نزدیک انسان مجبور محض ہرگز نہیں۔ ماحول کے اثرات سے غیر محفوظ کردار زندگی کے کسی نہ کسی پڑاؤ پر شکست وریخت کے المیے سے دوچار ہونے کے بعد بھی زندہ رہنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ رویے زیست کی صداقت کے گواہ ہیں۔

غیاث احمد گدی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'بابا لوگ'' کلچرل اکادمی گیا (بہار) سے جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ تب کتابت کے ذریعہ لیتھو پر کتابیں چھپتیں تھیں۔ ''بابا لوگ'' میں نو افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ آؤٹ آف پرنٹ ہے۔ افسانوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ایجوکیشنل پبلشنگ آف، دہلی نے آفسیٹ پر اسے شائع کیا ہے۔ جس سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس کا یقین ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

09430966156

OO

میں اُسے نہیں جانتا

غیاث احمد گدی اردو افسانہ نگاری میں ایک ایسا نام ہے جو چشم زدن میں اور آناً فاناً مشہور نہیں کیا گیا۔ ادبی گروہ بندی اور منصوبہ بندی اور اپنے آپ کو ادب کے علاوہ یا سوا دیگر ذرائع استعمال کر کے مشہور بنانے کی کوشش نہ خود غیاث احمد گدی نے کی اور نہ اس نے کسی پبلیسٹی کے ماہر کی خدمات حاصل کیں۔ نیت کا حال کہتے ہیں خدا جانتا ہے مگر ویسے بھی غیاث احمد گدی میں دیگر ذرائع استعمال کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اگر وہ کوشش کرنے کی جانب متوجہ بھی ہونا چاہتا تو اسے اس کی فرصت نہیں تھی۔

انگریزی وہ پڑھ نہیں سکا جس کے جا بے جا استعمال سے وہ اردو پڑھنے والوں اور لکھنے والوں پر رعب اور دبدبہ قائم کر سکتا۔ بڑے بڑے مغربی اور دوسرے غیر ملکی فن کاروں اور دانش وروں کے نام سے وہ ناواقف رہا اس لئے وہ یہ تعویذ بھی مشہور و مقبول ہونے کے لئے استعمال نہیں کر سکا۔ زندگی نے اسے بہت سی چیزوں سے محروم رکھا مگر زندگی کے نہاں خانوں کے لئے وہ اجنبی نہیں رہا، زندگی نے اسے جہاں بہت سی چیزوں سے محروم رکھا وہاں اپنی خلوتوں میں غیاث احمد گدی کے لئے جگہ بنا دی۔ انسانی زندگی کے اسرار و رموز تک اس کی حیرت ناک رسائی بہت کم افسانہ نگاروں میں ملتی ہے۔

وہ دہلی، بمبئی، لکھنؤ، الٰہ آباد اور پٹنہ جیسے ادبی اور تہذیبی مراکز سے دور رہا، وہ ان ادبی ٹولیوں سے بھی الگ رہا کہ جو شہرت کے بتاشے تقسیم کرتے ہیں۔ ادبی ٹولیوں سے واسطہ رہتا تو شاید ناقدین ادب کی اس پر نظر پڑتی ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے تنقیدی مضمونچوں میں اس کا نام بار بار آتا۔ ''بہترین'' کہانیوں کے انتخابات میں اس کی کہانیاں آتیں۔ سیمینار اور سمپوزیم

میں حصہ لیتا اور واہ واہ کی لوٹ میں کچھ اپنی جھولی میں ڈال لیتا۔ اس سے یہ ہوا کہ غیاث احمد گدی اپنی انفرادیت اور سالمیت قائم رکھ سکا اور اس چیز نے آگے چل کر اسے ممتاز و منفرد بنایا۔

غیاث احمد گدی نے جب ہوش سنبھالا تو گھر چچا، چچی، بھائیوں، بہنوں بھتیجوں، بھانجوں سے بھرا پایا۔ مشترکہ خاندان کا پروردہ آبائی پیشے کے اعتبار سے دودھوں نہایا۔ مگر وہ کوئی جدید ڈیری فارم نہیں تھا۔ وہ خالص چھوٹا ناگپوری گوالوں کا گھرانا تھا۔ جہاں آدمی اور بھینسیں مساوی حقوق رکھتی ہیں۔ جہاں پنچایت سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ شادی بیاہ، جھگڑوں کے فیصلے، بٹوارے اور پنچایت کی عدول حکمی کی سزا ''حقہ پانی'' بندی ہوتی ہے۔ ایک طرف گوبر کا انبار ہے۔ گوئٹھے اور اُپلے تھاپے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف بھینسیں گاری جا رہی ہیں۔ بالٹوں میں دودھ جمع ہو رہا ہے۔ اور گھر کے مرد اور لڑکے ان بالٹوں اور بالٹیوں کو لے کر منہ اندھیرے گاہکوں کو دودھ پہنچا رہے ہیں۔ کوئی بھینس بیمار ہے تو دادا اس کے علاج میں محو ہیں۔ قسم قسم کی جڑی بوٹیوں کے طریقۂ استعمال سمجھا رہے ہیں اور اپنے پرانے کارنامے بیان کر رہے ہیں کہ جب کسی بھینس کو بچھو نے کاٹ لیا تو اس نے دودھ دینا بہت کم کر دیا۔ پھر انہوں نے ایسا علاج کیا کہ وہ ٹھیک ہوگئی۔ گجراتی بھینس، شاہ آبادی بھینس، چھوٹا ناگپوری بھینس، اُتری بہار کی بھینس سب کا موازنہ اور مقابلہ ہو رہا ہے۔ قبائلی زندگی کا نمونہ اگر دیکھنا ہو تو کسی چھوٹا ناگپوری گدی خاندان کی زندگی اس کا مکمل نمونہ ہے۔

اسی طریقۂ زندگی کا ایک قاعدہ نیم جوانی کی شادیاں بھی ہیں۔ ان شادیوں پر دولھا دولھن کا اختیار نہیں ہوتا۔ پنچایت ہی نسبت طے کرتی ہے۔ پنچایت ہی شادی کرا دیتی ہے۔ سو غیاث احمد گدی کی شادی بھی کم عمری میں ہی ہوگئی۔ چند برس کی بیاہتا زندگی بسر کرنے کے بعد بیوی بیمار ہوئی اور چل بسی — دو بچوں کو اپنا نمائندہ بنا کر یہ نیک بخت دنیا سے چلی گئی۔ اور جب سے آج تک غیاث احمد گدی ایک ایسے رنڈوے کی زندگی گذار رہا ہے جسے اپنی بیاہتا زندگی کی یادیں بے حد دھندلی نظر آتی ہیں۔ بیوی کی علالت اور اس زمانہ میں اس کی اپنی مجبوریاں جنھوں نے بیوی کا اچھا اور باضابطہ علاج نہ کرانے دیا، غیاث احمد گدی کو پوری تفصیلات کے ساتھ یاد ہیں۔ تلاش کرنے پر اس کے چہرے پر ان مجبوریوں کے نشانات مل جاتے ہیں جن کو چھپانے کی

اس کے انگلی پر گنے جانے والے دوستوں نے بہت ورغلایا اور اشتعال دلایا کہ وہ شادی کر لے۔ان کے اصرار پر وہ تیار بھی ہو جاتا ہے اور لڑکی تلاش کرنے کو بھی کہتا ہے مگر سچ مچ شادی کر لے۔ایسا اب تک نہیں ہوا ہے۔ پورے دس سال سے یہ موضوع زیرِ بحث آتا ہے اور اکثر آتا ہے مگر بحث کے نقطۂ عروج پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ سپر ڈال دیتا ہے اور بے حد آسانی کے ساتھ غیر مشروط طور پر شادی کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس موضوع پر بحث اور شادی دونوں التوا میں پڑ جاتی ہیں۔

پتہ نہیں ایسی قبائلی زندگی گذارتے ہوئے کب اور کہاں کسی فرشتے نے اس کے کان میں پھونک دیا—— ''اُٹھ!—اور لکھ!''

اور غیاث احمد گدّی نے گوبر، بھینس، دودھ سب میں شریک رہ کر لکھنا شروع کر دیا۔ وہ زندگی کے جہنم میں بے دریغ گھس گیا کیونکہ اسے جہنم سے روشنی لانی تھی——

میں آج جہنم جا رہی ہوں۔جہنم سے روشنی لانے۔''

(ڈورتھی جون سین)

شاید وہ ۱۹۴۹ء تھا کہ غیاث احمد گدّی سے رانچی میں ملاقات ہوئی کرشن کنھیا سے زیادہ گہرا رنگ، پان سے منہ بھرا ہوا، پائجامہ پر ہاف قمیص اور چپل—— یہ غیاث احمد گدّی تھا۔ہم عمر، مگر جیسے زندگی کی اُڑان اور گہما گہمی سے دور، بے حد سنجیدہ اور گھبرایا ہوا۔اور جھینپا ہوا۔جوانی کی وہ اُمنگ، وہ ولولہ، وہ جوش، جانے کیوں اس میں دور دور تک نظر نہ آیا۔آنکھوں میں روشنی یقیناً غیر معمولی تھی۔اس وقت تک کوئی فرشتہ اس سے یہ کہہ چکا تھا کہ ''اُٹھ اور لکھ—!'' اس کی آنکھوں کی غیر معمولی روشنی کائنات کے اسرار و رموز کے سینوں میں اُترنے کے لئے بے قرار تھی—— روشنی کے نیزے سنبھالے وہ تخلیقی ہنرمندی کو اپنے بس میں کر لینے پر جیسے تلا ہوا تھا اور اس کٹھن راہ کی ساری پیچیدگیوں اور خطروں سے واقف تھا کہ جس نے سنجیدگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔آنکھوں میں غیر معمولی روشنی اور لبوں پر جیسے پیاسی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

''میری آتما بڑی پیاسی ہے۔سمندر کے سمندر پی جاؤں،

جب بھی یہ پیاس نہیں، بجھنے کی——''

(جوہی کا پودا اور چاند)

وہ زمانہ ادبی دھما چوکڑی کا تھا۔ نعروں اور مینی فسٹوؤں میں تخلیق کہیں گم ہوگئی تھی ادب کہیں دبک گیا تھا اس لئے ادب پر کمیونسٹ پارٹی کی سل میٹنگوں کے ہیرو سوار ہو گئے تھے۔ جو اپنا اچھا خاصا لباس اتار کر جانگیہ پہن کر خود کو ڈی کلاس کر لیا کرتے تھے۔ غیاث احمد گدی اور اس جیسے ادیب و شاعر چلّو بھر پانی لے کر اس آگ کو بجھانے کے لئے حیران دوڑ رہے تھے۔ ان کہانیوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی کسے فرصت تھی؟ کوریا میں امریکی سپاہی کی کٹی ہوئی ٹانگ پر مرثیے لکھے جا رہے تھے۔ ایسے میں غیاث احمد گدی تیقن اور خلاقانہ غیرت کے ساتھ لکھتا رہا۔

ادبی میدان کارزار کا گرد و غبار بیٹھا تو ـــــ غیاث احمد گدی کائنات کے دکھوں کا سارا 'بوجھ' اپنے شانوں پر اٹھائے کول فیلڈ کے تالابوں میں اپنی بھینسوں کو نہلاتا ہوا ملا، بھینس کی کشادہ پیٹھ پر بیٹھ کر وہ ایسے افسانے تخلیق کرتا رہا جنہوں نے بڑے بڑے رسالوں میں بلا سفارش اور پیروی جگہ پائی اور سنجیدہ داد پائی۔ غیاث احمد گدی اپنے فن کی بڑائی کے بل بوتے ہی پر نقادوں کے قلم کی نوک پر آیا۔

منصوبوں، ہوٹل اور کیفے بازیوں، سیمینار اور سمپوزیم بازیوں سے دور دور غیاث احمد گدی نے زندگی اور افراد کے سینوں کے زخموں کو ایک ایسے مسیحائی زاوئے سے دیکھا جو اردو میں نیا تھا۔ اور جو اتنا معصوم اور سادہ تھا کہ اس سج دھج کی دنیا میں وہ بے حد ممتاز اور نمایاں ہو گیا۔ انسان کے اندر تک پہونچنے کی فنکارانہ کوشش اُردو میں جس طور پر غیاث احمد گدی نے کی وہ سو فی صدی اس کی اپنی ہے۔

افسانہ نگاری غیاث احمد گدی کا نہ پیشہ بنا، نہ فیشن، نہ پاسٹ ٹائم اور نہ ہابی، افسانہ نگاری اس کے لئے ایک ضرورت ہے وہ تخلیقی لاوا جو اس کے اندر ابل رہا ہے اسے ماحول، وقت، ساری دنیا سے بے نیاز بنا دیتا ہے اور وہ کبھی بھینس کی پیٹھ پر، کبھی تالاب کے کنارے کبھی اس مٹھائی والے کی دکان کی بینچ پر جسے وہ دودھ دینے جاتا، لکھنے بیٹھ جاتا افسانہ نگاری اس کی ضرورت ہے اس لئے وہ اسے ٹال نہیں سکتا۔ خوبصورت قلم، نفیس کاغذ، لکھنے کا اہتمام ـــــ ان سب سے بے نیاز اسے افسانہ لکھنا پڑتا ہے۔ وہ اس سے گریز نہیں کر سکتا۔

"یہ بھری پڑی دنیا، ایسی خاموش، ایسی
سنسان جان پڑتی ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے

سوچتا ہوں، بولوں نہیں، ہنسو نہیں تو ــــ
کہیں یہ سناٹا مجھے نگل نہ لے ــــ ــــ"

(بابے)

ایسا لگتا ہے جیسے غیاث احمد گدی کہہ رہا ہو ــــ قلم نہ اُٹھاؤں لکھوں نہیں تو ــــ ــــ یہ سناٹے کہیں مجھے نگل نہ لیں۔

افسانہ 'بابا لوگ' کہاں سے آیا؟ 'منظر و پس منظر' کہاں سے آیا؟ 'ڈور تھی جون سین' کہاں سے آیا؟ 'صبح کا دامن' کہاں سے آیا؟ ــــ

اس کے گھر کے ماحول سے؟ وہ ماحول جس کا مختصر ذکر اوپر آچکا ہے؟ اس شہر کے ماحول سے؟ جس شہر میں دور دور کرسچن نہیں رہتے۔ جو شہر کوئلوں کا بازار ہے! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ غیاث احمد گدی کا کوئی افسانہ بھی اس کے ماحول سے مطابقت یا مماثلت نہیں رکھتا۔ کیا یہ حیرت ناک بات نہیں ہے؟

مگر اس سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ کسی نقاد نے اسے بلونت سنگھ کی طرح مقامی اور ملکی رنگ رکھنے والا افسانہ نگار لکھ دیا جس طرح بلونت سنگھ کے یہاں پنجاب ہے اسی طرح غیاث احمد گدی کے یہاں بہار ہے ــــ! خیر یہ تو لاعلمی کی بات ہے اس لئے درگزر ہی کیا جاسکتا ہے۔

ویسے بھی بلونت سنگھ اور غیاث احمد گدی میں نہ صرف فرق ہے بلکہ فرق مرتبہ بھی ہے۔ غیاث احمد گدی کا گداز دل مرحوم اور بلونت سنگھ کا کھلنڈرا پن ــــ بلونت سنگھ کا عسکری اور داستانوی مزاج اور غیاث احمد گدی کا دلوں میں اُتر جانے والا مسیحائی اپروچ اور سچائی تخلیق کرنے کا مجذوبانہ وقار اور رشی کے گیان کی روشنی ــــ غیاث احمد گدی کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری کس قدر گہری بصیرت، کتنے عمیق مشاہدے اور پرواز خیال پر کتنی قدرت حاصل کرنے کے بعد غیاث احمد گدی میں ڈھل جاتی ہے ــــ

"انسان کی مملکت کی کھونٹ کھونٹ کی میں نے سیر کی ہے.....
..... درد کے زہر کو کسی بھولے شنکر کی طرح اپنی روح میں اتارا ہے اور تم لوگ جس بظاہر ہرے بھرے تنے کو دیکھ کر استعجاب کی دنیا میں کھو جاتے

ہو، وہ تناور درخت اندر ہی اندر اس درجہ کھوکھلا ہے کہ اس میں گندی چمگادڑوں نے گھونسلہ بنالیا ہے۔"

(بابے)

اُردو کیا شاید ہندوستان، پاکستان کا ایک بھی افسانہ نگار ایسا نہ ہوگا جس نے تیس پینتیس برس کی عمر تک بھینسیں چرائی ہوں ان کو گندے تالابوں اور گڑھوں میں نہلایا ہو۔ صبح سے شام تک میدانوں میں چرایا ہو، اور دھوپ کی تمازت سے پناہ حاصل کرنے کے لئے کسی ٹنڈ منڈ پیڑ کے تنے کے سائے میں بھینسوں کی رکھوالی کرتا رہا ہو اور جب افسانہ نگاری کا لاوا اُبل پڑے تو اسے پیلے بے سائز اور مڑے چڑے کاغذوں پر پنسل سے منتقل کر لیتا ہو۔

پچھلے دس بارہ سال سے وہ اپنی قبائلی زندگی کو تیاگ چکا ہے اور چھوٹے موٹے کاروبار کو ذریعہ معاش بنائے ہوا ہے۔ اس کی بیوی نے اپنے جن دو نمائندوں کو دنیا میں چھوڑا تھا وہ اب کالج کے طالب علم ہیں، ان کی تعلیم اور دیگر ضروریات کے لائق غیاث احمد گدی نے معقول آمدنی کا نظم کر دیا ہے۔

اور تب اسے اچانک لگا جیسے اس کی زندگی بیوی کے مرجانے کے بعد اتنی اکیلی اور ویران نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہوگئی ہے دور دور تک اسے اس تنہائی میں کوئی نظر نہیں آتا، کوئی اجنبی بھی نہیں، بلکہ وہ خود اپنے آپ کے لئے اجنبی ہوگیا ہے۔ اپنے آپ میں تنہا ہوگیا ہے۔

وہ جو 'بوجھ' لے کر چل پڑا تھا۔ وہ اب اور بھی بھیگ گیا ہے۔ اور وزنی ہوگیا ہے۔، مگر وہ جو کسی فرشتے نے اسے اس روز کہا تھا——

"اُٹھ——اور لکھ!!"

سو وہ آج آدمی کے خانے تہہ خانے کی کھوج میں یوں چلا جا رہا ہے جیسے اس نے یہ سفر آج ہی شروع کیا ہو——اتنا ہی سنجیدہ، اتنا ہی تازہ دم——!

——کلام حیدری——

OO

بابالوگ

بابالوگ سب کمرے میں آجاؤ ـــــ اَم تم کو کہانی سنائے گا ـــ!

پھر بابالوگ یہ سنتے ہی کمرے میں آگئے۔ اور بڈھے انکل کے مونڈھے کو یوں گھیر لیا، جیسے اکسمس کی ننھی ننھی موم بتیاں ہوں جو بڑے سے کیک کے چاروں طرف استادہ کردی گئی ہوں۔

بڈھے انکل نے ایک بار نگاہ اٹھا کر ساتوں بچوں کا جائزہ لیا۔ پھر جیب سے اَدھ جلا سگار نکالا۔ سگار کو جلانے سے پہلے قریب کھڑے ہوئے سب سے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اور اس کے سرخ پھولے ہوئے گالوں کو چومتے ہوئے بولا۔

''بلّو ڈولی ڈارلنگ تم کیسا ماپھک ہے ـــ؟!!

''اچھا ماپھک ہے، ام کو کہانی سناؤ، ابی.....ورنہ ام مارے گا! سنائے گا ـــ؟''

''ضرور سنائے گا ـــ'' بڈھے انکل نے آہستہ سے بچے کو گود سے اتار دیا۔ لبوں سے لگے ہوئے سگار کو جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اور اس کا بجھا بجھا چہرہ چمک اُٹھا۔ جیسے ایکا ایکی چاند پر سے بدلی ہٹ گئی ہو۔

''بابا، تم لوگ ام کو ایک بات بتائے گا۔ پھر کہانی سنائے گا۔''

''بتائے گا ـــ بتائے گا ـــ'' بابالوگ نے ایک زبان ہوکر کہا۔

''تو بولو یہ دنیا اتنی بیوٹی فل کیوں ہے؟''

بچے، جن سے کئی بار یہ سوال دہرایا گیا ہے وہ حسبِ دستور ایک زبان ہوکر چاند کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ ''مون سے.....!''

''ویری گڈ، مون ایسا چمکتا ہے جیسے ـــــ'' بڈھا انکل ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔

ایک نظر اس نے سب بچوں پر ڈالی۔ پھر سب سے خوبصورت بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔۔۔ ''جیسے اپنا بے بی ڈولی۔۔۔۔'' پھر اس نے چاند کی طرف نظریں گاڑ دیں۔۔۔۔ جیسے اپنا بے بی مارگیٹ.....!''

سب بچوں نے مل کر تالیاں بجادیں۔ جس کو سن کر بڈھا انکل جو دور آسمان کے پھیلاؤ میں چمکنے والے چاند پر کمندے ڈال رہا تھا۔ اپنی جگہ واپس آ گیا۔

''بڈھا انکل، کہانی مانگتا..... کہانی مانگتا.....'' بابالوگ تالیاں بجا بجا کر شور کر رہے تھے۔

پھر کہانی شروع ہوگئی۔

''..... جب کینگ باہر سے شراب پی کر آتا تو خوب شور کرتا، کوئین کو گالیاں بولتا، اس کو خوب مارتا، نوچتا، کُتا ماپھک۔ اور بولتا۔ ام بے بی مانگتا، سَن مانگتا..... کوئین کچھ نہیں بولتا۔ وہ بہوت روتا، دھیرے دھیرے روتا، ایسا ماپھک جیسے ٹائم پاس ہوتا۔ کوئین روتا۔ اس ٹائم اس کا ایک خانساماں ہوتا۔۔۔۔ بابالوگ خانساماں جانتا۔ امارا ماپھک خانساماں.....''

پھر بابالوگ جو سینکڑوں بار دُہرائی ہوئی کہانی سُنتے سنتے اکتا چکے تھے شور کرنے لگے۔

''نہیں مانگتا۔ یہ کہانی نہیں مانگتا..... یہ اولڈ کہانی نہیں مانگتا..... نیو لاؤ، نیو.....''

اس وقت بڈھے انکل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کدر سے لائے گا کدر سے نیو لائے گا، بابالوگ۔۔۔''

وہ برسوں کا بھوکا بَیل ماضی کے چٹیل میدان میں حسب دستور منھ مارنے لگا۔ شاید کوئی پودا مل جائے..... شاید کوئی ہریالی نظر آ جائے۔ اپنا تو سب کچھ لُٹ گیا۔ ایک چھوٹا سا پودا تھا۔ اس کے آس پاس کتنا بڑا بڑا کانٹا والا تار لگا دیا ہے۔ دنیا والا، تم کو کیسے بولے گا۔ کیسے بتائے گا.....!

''اے بڈھا! تم آپ سے آپ کیا بکتا ہے؟'' بڈھا انکل ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا سلگتا ہوا سگار اس کے کپڑوں پر گر گیا ہو۔۔۔!''

''نہیں بے بی کچھ نہیں بکتا۔۔۔'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مسکرایا۔۔۔۔ ابی بابالوگ تھا، کہانی سنتا تھا.....''

اس کی تیوریاں چڑھ گئیں — ''ام تم کو بہوت بولا۔ تم بابالوگ کو مت کھراب کرو۔ بڈھا تم سنتا کیوں نہیں — ؟''

اب نہیں کھراب کرے گا۔ بے بی اسکیوزمی، بے بی .....'' اس کا ہاتھ آپ سے آپ گردن اور سر کو سہلانے لگا۔ اب کبھی نہیں کہانی سنائے گا.....''

مارگریٹ منھ ہی منھ میں بڑبڑاتی اپنے نئے دوست جارج کی بانہوں سے لگی آگے بڑھی۔ بڈھے انکل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ہمت کر کے مارگریٹ کو دیکھا۔

''پر بے بی ایک بات سنے گا — ؟''

''کیا بولنا مانگتا — ؟''

بڈھا انکل ہنسنے لگا — ''بے بی، جب تم چھوٹا تھا، بہوت کہانی سنتا تھا..... اپنا ڈولی ماپھک.....!''

''شٹ اپ، یونان سنس.....''

پھر وہ چپ چاپ اپنے میلے جیکٹ واسکٹ کی جیب میں اَدھ جلے سگار کو ٹٹولتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنی چھوٹی سی چارپائی کے جھلنگ میں دھنس گیا..... .....ڈوبتا چلا گیا۔ وقت کتنی تیزی سے بھاگتا ہے۔ جیسے..... جیسے بابالوگ کی گیند ——— بے بی کس طرح اس کی گود میں بیٹھ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی مونچھ کو پکڑ کر کھینچتی تھی۔ انکل کہانی مانگتا..... کہانی سناؤ اَم کو.....!

مگر اب بے بی کہانی نہیں مانگتا۔ اس پودے کے تنے موٹے ہو گئے ہیں۔ قد لمبا ہو گیا ہے۔ پہلے وہ کہانیوں کے جھولے میں جھولنے کے لئے کیسے مچلا کرتی تھی مگر اب خود چاہتی ہے کہ کوئی اس کے تنے میں رسیوں کو جھولا لگا کر لمبی لمبی پینگ کھائے..... اور کہیں وہ تنا ٹوٹ گیا تو — ؟ خم کھا گیا تو؟..... بے وقوف بچی، پھر زندگی کا بارگراں تو کیسے اٹھا سکے گی — ؟؟؟؟ بول..... بول..... نادان مارگریٹ؟

مارگریٹ کے کمرے سے قہقہے کی آواز آ رہی تھی..... رات تاریک ہے۔ گھر میں صائب نہیں، میم صائب نہیں..... اور بے بی کمرے میں ایک نوجوان کے ساتھ..... اس نے عقیدت سے سینے پر صلیب بنائی ——— ''یسوع مسیح! میرے ننھے پودے کو اس بادسموم سے

بچاؤ ـــــ!!

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بے بی کے کمرے میں جلتی بجھتی روشنیوں میں دو سائے آپس میں خلط ملط ہو رہے ہیں۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا۔ پیروں میں فل بوٹ پہنا، کھونٹی سے پرانی، تیل سے داغ دار فِلٹ اٹھا کر آہستہ سے سر پر رکھ لی۔ برآمدہ طے کرتے ہوئے سیدھا بے بی کے کمرے کے پاس رک گیا۔

"بی بی ـــــ مارگریٹ بے بی! دروازہ کھول ـــ"

کمرے میں اچانک ابتری پھیل گئی..........

"کیا ہے بڈھا، کیا مانگتا..........؟"

"بے بی صائب آتا۔ ابھی اُدر میں اُم جیپ کا لائٹ دیکھا.........."

دونوں جلدی جلدی ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ بے بی نے اپنے الجھے ہوئے بالوں کو جلدی جلدی درست کر لیا۔ پھر دونوں نے اپنے اپنے سامنے میز پر تاش کی پتیاں یوں پھیلا لیں۔ گویا کھیل گھنٹوں سے ہو رہا ہے۔

بڈھا انکل نے دوبارہ صلیب بنائی۔ یسوع مسیح! بے بی کو بچاؤ.......... من ہی من میں اس نے شکریہ ادا کیا۔ اور برآمدے میں سرکنڈے کی کرسی میں دھنس گیا۔

وہ جو ایک پتھر سا تھا آپ ہی آپ کھسک گیا۔ پھر جب کافی دیر ہو گئی اور صاحب نہیں آیا تو ڈرائنگ روم سے بے بی پاؤں پٹختی ہوئی باہر آئی۔ اور بڈھا انکل کو کرسی پر اونگھتا ہوا دیکھ کر اس نے سینکڑوں گالیاں دیں.......... "یو بلاڈی فُل، تم جھوٹ بولتا۔ اُلو۔ گدھا تم کِدر کو جیپ دیکھا؟ تم کو نیا میم صائب ٹھیک گالی دیتا۔ دھکا مارتا.......... اُلو.........."

"دیکھا، بائی گاڈ، بے بی! ابی اِدر میں لائٹ دیکھا۔ ام سے بھول ہوا۔ وہ دوسرا جیپ ہوگا۔

مارگریٹ گالیاں بکتی پھر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ حسرت سے بڈھا انکل نے ایک لمبا سانس لیا۔ "یسوع مسیح! بے بی کو بچاؤ۔ اپنا بے بی بہوت چھوٹا ہے۔ کچھ نہیں جانتا۔ بائی گاڈ وہ ہنڈریڈ تک گننا نہیں جانتا۔ وہ بہوت مشکل پھنسنے جاتا۔ اس کا ہلپ کرو۔ یسوع مسیح اس کا ہلپ کرو.........." وہ رونے لگا۔ سسک سسک کر رونے لگا۔ پھر وہ چپ ہو گیا۔ اور حسبِ عادت

بیٹھا بیٹھا اونگھنے لگا۔

وقت بوند بوند کر کے گرتا ہے۔ اور خشک زمین پر گر کر کیسا سوکھ جاتا ہے۔ بس دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ فرش پر صرف اس کا نشان رہ جاتا ہے۔ جس سے سوندھی سوندھی خوشبوں نکلتی ہے..... نکلتی ہی رہتی ہے کبھی بند نہیں ہوتی۔ اور اب بڈھے انکل کی بے مصرف زندگی میں بجز اس بو کے سونگھتے رہنے کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ کچھ کام نہیں۔ کمینوں کی طرح نئی میم صاحب کی گالیاں سن کر بھی روٹی کا خشک ٹکڑا گلے سے اتارتے ہوئے اس کے حلق میں کچھ نہیں پھنستا وہ مزے سے گردن جھکائے کھاتا رہتا ہے۔ پہلے جب ابھی چراغ گل نہیں ہوا تھا۔ وہ بھڑک اٹھتا اور پرانے سخت فل بوٹ کو گھسیٹتا دہلیز کو بھی عبور کر جاتا۔ مگر صاحب پھر اسے واپس بلا لیتا۔ صاحب نہیں، اس کے اندر سے ایک جانی پہچانی، مگر وقت کی بوند میں جذب ہوتی آواز اس کے پیروں سے چمٹ جاتی۔ پھر اس وقت اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سوندھی سوندھی بو اس کے نتھنے سے ہوتی ہوئی سارے اعصاب پر چھا جاتی۔ اور اب اس کی بے مصرف، بے کار زندگی میں بجز اس بو کو سونگھتے رہنے کے رہ ہی کیا گیا ہے۔ مارگریٹ بے بی تم بھی تو ایک قطرہ ہو جس میں تمہاری ماں کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

''میں اس خوشبو کے بغیر کیسے زندگی رہ سکتا ہوں بے بی؟ کیسے زندہ رہ سکتا ہوں.....؟''

باہر ایک ہچکولے کے ساتھ جیپ کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ بڈھا انکل نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کچھ پاتے پاتے اس نے کھو دیا۔ پھر اس کے کانوں میں جوتے کی آواز آئی۔ وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیچ بھری ہوئی آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے نم ہو رہے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آستین سے آنکھیں پونچھ لیں۔

برآمدے کو عبور کر کے نئی میم صاحب اس کے سامنے آ گئی — ''یو بڈھا، تم اِدر میں کیا کرتا —؟'' اس نے نفرت سے بڈھا انکل کو گھورا'' — کیا چوری کرنا مانگتا؟''

''نو میم صائب ایسا ماپھک نہیں۔ ادر بے بی ہے نا.....'' وہ رک گیا۔ کیا وہ سچ کہہ دے؟ نہیں! نئی میم صائب ابھی بے بی کو بہوت گالیاں دے گی۔ بہوت جھگڑا کرے گی۔ سوتیلی ماں ہے نا! بہوت تکلیف دے گی.....'' اس کا دل لرز گیا۔

''بے بی ہے تو تم کیا کرتا بڈھا؟'' نئی میم صاحب نے چشمہ اتار کر اپنے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، وہ اپنے فرینڈ کے ساتھ رمی کھیلتا.....'' اور وہ گردن جھکائے وہاں سے ٹل گیا۔

پھر ایک دن بڈھے کی نگرانی اور ڈھٹائی سے تنگ آ کر بے بی نے شکایت کر دی۔ ''پپا ڈارلنگ! اس کمینے کتے کو باہر نکال دو۔ وہ مجھے بہوت ڈسٹرب کرتا۔ مفت کی روٹیاں توڑتا ہے .....''

پپا پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے مسکرائے۔ پھر بے بی کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولے —— نہیں بے بی! تم ایسا ماپھک نہ کہا کرو۔ وہ بڈھا بہوت اچھا آدمی ہے۔ وہ اماری تماری خدمت کرتے اس عمر کو پہونچا ہے وہ بہوت نیک ہے.....'' اور کہتے کہتے پپا اپنے آپ میں گم ہو گئے۔ ''تم نہیں جانتیں، بے بی ڈارلنگ! جب تم ابی نہیں آئی تھیں۔ اور میں شراب کے نشے میں تماری ماں کو محض اس لئے زدوکوب کرتا کہ وہ مجھے ایک بچہ دینے سے مجبور تھی۔ تو بڈھا تماری مدر کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور پھر بید پورا اس کے جسم پر ٹوٹ جاتا۔ وہ اُف تک نہ کرتا۔ صرف اس کے چہرے پر تکلیف کے باعث لکیریں بنتیں، بگڑتیں اور آنکھوں سے پانی جھر جھر بہتا۔ وہ چپ چاپ سہہ جاتا پھر بے بی تم آئیں اور تماری مدر اسی رات مر گئی۔ تو وہ کیسا رویا کیسا تڑپا تھا میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا.....''۔

''مگر پپا وہ کم بخت میرے آگے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا ہے۔ گویا میں اس کی قید میں ہوں.....!''

''نو، بے بی وہ تجھے بہوت چاہتا، بہوت چاہتا ہے..... بالکل اپنا بے بی سمجھتا ہے۔'' پپا ہنس دیئے۔ ''بے بی جب تم بہوت چھوٹی تھیں، جب بھی وہ اسی طرح تمارے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ جب تم بہوت روتیں اور آیا تم پر غصہ ہوتی تو وہ چڑ کر اس سے چھین لیتا..... آیا جب تمہیں دودھ پلا رہی ہوتی تو وہ کہیں سے چھپ کر دیکھ رہا ہوتا۔ میں نے ایک دن پوچھا۔ ایسا ماپھک کیوں؟ بولا، آیا بے بی کا دودھ پینا مانگتا.....'' پپا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ پھر جب وہ عید کے روز نماز پڑھنے جاتا تو جانے سے قبل تمہیں اپنے ہاتھوں سے نہلاتا،

بہوت اچھا اچھا کپڑا پہناتا.....نماز سے واپس آتا تو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا۔اور تمہیں گود میں اٹھا کر پیار کرتے وقت پتہ نہیں کیوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔اور اس وقت تک روتا اور تمہیں پیار کرتا جب تمہاری اسٹیپ مدر آکر اُسے گالیاں نہ دیتی۔ایک روز میں نے اُس سے رونے کا سبب پوچھا۔تو بڈھا بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔امارا بھی ایسا ماپھک ایک بے بی ہے۔ایک دم اپنا بے بی ماپھک.....مگر میں جانتا ہوں اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔وہ چودہ سال کی عمر سے تو میرے پاس ہے.....''

''مگر پپا، وہ تو بچپن کی بات ہے۔اب اگر وہ میرے جسم کو چھولے تو میں جب تک تین بار نہاؤں نہیں مجھے چین نہیں آئے گا۔''

''نو بے بی—ایسا نہیں بولنا چاہیے۔''

''نو پپا—آپ اس بلاڈی کو ڈانٹ دیجئے۔وہ میرے معاملات میں دخل نہ دے۔!''

''اچھا اچھا میں اسے منع کردوں گا، تم غصہ نہ کرو۔مگر بے بی، اس دن بڈھا تمہیں واقعی کہیں لے کر چلا جاتا اور واپس نہ آتا تو جانتی ہو آج تم اس کی بچی کہلاتیں.....پپا ہنسنے لگے—''بے بی یہ بڈھا ایک دن تمہیں لے کر کہیں بھاگ گیا تھا.....''

''ہائے پپا—؟''اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تعجب سے کہا۔

ہاں بے بی، جب تم بہوت چھوٹی تھیں۔تمہاری نئی ماں آئی تو اس نے پیسے کی بچت کے خیال سے تمہاری آیا کو ہٹادیا۔اور خود تمہاری دیکھ بھال کرنے لگی مگر—''پپا نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔''مگر اسٹیپ مدر اپنی ماں کہاں ہوسکتی ہے۔وہ تمہیں بہوت تکلیف دینے لگی۔تم دودھ کے لیے چلاتی رہتیں اور وہ ڈریسنگ ٹیبل سے نہ اٹھتیں۔تمہارے کپڑے پیشاب سے تر رہتے اور تم اس میں پڑی رہتیں.....شاید یہی سب دیکھ کر بڈھا انکل نے ایک روز مجھ سے شکایت کی۔میں نے نئی میم صاحب کی شکایت سن کر اس کے ایک طمانچہ رسید کیا اور کمرے سے باہر نکال دیا۔جس کے بعد چند دنوں تک وہ خاموش رہا۔مگر ایک دن پتہ نہیں کیوں تمہیں اٹھا کر کہیں لے گیا.....''

''پھر میں کیسے لائی گئی پپا؟''بے بی دلچسپی محسوس کرنے لگی۔

''وہ آپ ہی آ گیا۔ دن بھر ام لوگ بہوت پریشان رہے۔ لوکیلٹی کا چپہ چپہ چھان مارا مگر پتہ نہ چلا۔ پورے شہر میں تلاش کیا۔ تھانے میں رپٹ دی ——— لیکن شام ہوتے ہی دیکھا وہ تمہیں گود میں لئے حسب دستور ٹھہر ٹھہر کر چلتا ہوا آ گیا۔ ام لوگ دنگ رہ گئے اس کی ڈھٹائی پر۔ تمہیں بیڈ پر ڈال کر وہ کونے سے موٹا بید لے آیا اور قمیض اُتار کر میرے پیروں پر جھک گیا.....''

''پھر آپ نے بہوت پیٹا ہوگا اسے؟'' بے بی اندرونی طور پر قدرے خوش ہوئی۔

''نہیں بے بی، میں نے ایسا نہیں کیا ——— اسے کچھ نہ بول سکا۔ زبان ہی نہ کھلی۔ جیسے تمہاری ممی میرا ہاتھ روک رہی ہو۔ اس گھر میں یہ بڈھا ہی تو اس کا ہمدرد تھا نا۔ اس نے ضرور میرا ہاتھ روک لیا ہوگا.....''

''مگر پپا، یہ بڈھا تو خراب.....''

''نہیں بے بی ایسا نہیں۔ وہ بہوت اچھا آدمی ہے۔ ضرور اچھا آدمی ہے یسوع مسیح اس پر مہربان ہے۔ تماری اسٹیپ مدر اس کے ساتھ کُتا جیسا بی ہیو کرتا۔ مگر تم ایسا مت کرو۔ وہ بہوت اچھا بڈھا.....''

تیسرے دن صبح جب پرانے چرچ کی منہدم دیواروں کی اوٹ سے ابھی زرد سورج ابھر رہا تھا۔ اور زرد پیاری دھوپ کیاریوں کے ننھے ننھے پودوں کو دھیرے دھیرے چوم رہی تھیں۔ بڈھا انکل مرغیوں کے بڑے سے پنجڑے کے قریب بیٹھا انہیں دانہ کھلا رہا تھا۔ صاحب نے اسے ٹوکا۔

''بڈھا انکل کیا کرتا اِدر میں ——؟''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سر سے فلیٹ اُتار کر ایک ذرا گردن جھکا کر گڈ مارننگ کیا۔ اُدر میں اپنا مرغی لوگ کو دانہ کھلاتا صائب ——— اپنا کالا والا مرغی بیمار مالم پڑتا، اس کو لہسن دیتا۔ یہ مرغی بہوت اچھا ہے، صائب، بائی گاڈ بہوت اچھا والا ہے.....!''

''بڈھا انکل، تم بھی بہوت اچھا والا ہے۔ بائی گاڈ بہوت اچھا والا۔'' صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑا ——— ''پر انکل اپنا بے بی تمارا شکایت کرتا۔ تم اس کو ڈسٹرب کرتا۔ ایسا مت کرو۔''

''پر صائب، ام بھی ایک بات بولنا مانگتا.....'' وہ اچانک بات کاٹ کر کہنے لگا۔

سنے گا صائب؟''

''ضرور سنے گا بڈھا انکل .... بول ــــ''

''صائب .... اپنا بے بی .... مارگریٹ بے بی .... اور وہ جارج .... وہ جارج کو جانتا صائب، اپنا بے بی کا فرینڈ ہوتا.........''

''ہاں ہاں جانتا، تم بولو کیا اس کے بارے میں بولنا مانگتا؟''

بڈھا انکل کچھ دیر خاموش زمین کو تکتا رہا۔ پھر بولا۔ صائب وہ جارج اچھا نہیں۔ وہ اپنا لوکیلٹی کا ایک بے بی کو .... وہ بہوت خراب صائب ام جانتا.........''

صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''تم کیا بولنا مانگتا .... انکل .... ویری بیڈ .... تم سرونٹ، سرونٹ ماپھک رہے گا۔ امارا گھر کا بات میں کچھ نہیں بولے گا .... اپنا بے بی اچھا .... اپنا جارج اچھا .... تم جھوٹ بولتا .... ایسا ماپھک نہیں بولے گا کبھی ....''

برسوں بعد آج صاحب کے منہ سے سخت الفاظ سن کر اُس کا دل بھر گیا۔ اُس نے ایک بار نظر اُٹھا کر صاحب کو دیکھا جو سامنے کھڑا عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''امارا بات سمجھا ــــ؟''

''سمجھا صائب، اب کبھی نہیں بولے گا .... اسکیوزمی صائب،''

وہ پھر جھک کر مرغیوں کے جال دار ڈربے میں دانہ پھینکنے لگا۔ اپنا بے بی اچھا .... اپنا جارج اچھا .... اپنا کتا بھی اچھا۔ فقط یہ بڈھا نہیں اچھا۔ بڈھا بہوت خراب .... یسوع مسیح، یہ دنیا کیسا ماپھک ہے .... کیسا ماپھک ہے ....''

بڑی مہری والی خاکی پتلون، ملگجی قمیض، پرانے بوٹ اور چھوٹے چھوٹے سیاہ بالوں سے بھرے سر پر تیل اور سڑک کی دھول سے داغ دار فلیٹ .... صبح کو اس نے کھانے کے بعد ڈریس کیا اور دس بجے سے قبل وہ صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''گڈ مارننگ صائب ....!''

اوہ، گڈ مارننگ بڈھا انکل! آج مارننگ کو ڈریس کیا۔ کِدر جانا مانگتا؟''

''صائب آج جمعہ ہوتا۔ آج ام شہر جانا مانگتا۔ ادر میں مسجد میں نماز پڑھنا مانگتا.........

.....خدا سے دعا کرنا....."

صاحب نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مگر انکل، آج تم کیا جانا مانگتا۔ اور شہر میں دنگا ہوتا۔ ہندو مسلمان کا جھگڑا ہوتا۔ اور میں تم کو کوئی مار دیا تو ——— کیا تم نہیں جانتا؟"

"نو صائب ام جانا مانگتا۔ اور مسجد میں دعا مانگنا مانگتا۔ اور میں ام کو کوئی نہیں مارتا۔ یسوع مسیح امارا ہلپ کرتا" اس نے اُنگلیوں سے صلیب بنائی "صائب! ام کو آرڈر دو ——— ام جلدی جائے گا.....؟"

"تم نہیں مانے گا بڈھا انکل، جائے گا" ——— صاحب مسکرانے لگا۔ "تو جاؤ پر ہوشیاری سے اپنے آپ کو بچا کر....."

پھر بڈھے انکل نے صاحب کو جھک کر سلام کیا اور حسب دستور علاقے کے ہر راہ گیر کو گڈ مارننگ کرتا۔ جب چرچ کے سامنے پہنچا تو اس نے آہستہ سے جھک کر سر سے فلیٹ اتار لی۔ سینے پر صلیب بنائی ——— "یسوع مسیح اپنا بے بی کا ہلپ کرو۔ اپنا بے بی کچھ نہیں جانتا۔ وہ بائی گاڈ ہنڈ ریڈ تک گننا بھی نہیں جانتا۔ یسوع مسیح ام جانتا، وہ لڑکا ویری بیڈ..... اس نے بنگ صاحب کی لڑکی کو خراب کیا..... بے بی کا ضرور ہلپ کرو..... یسوع مسیح امارا ابھی ہلپ کرو۔ ام مسجد جاتا۔ اپنا گاڈ کے پاس بے بی کے واسطے دعا کرنے۔ اور میں ہندو لوگ مسلمان کو مارتا۔ امارا ہلپ کرو ——— ام کو کوئی نہیں مارے گا..... پھر اس نے انگلیوں سے کندھے اور سینے میں صلیب بنائی اور آگے بڑھ گیا۔

واپسی پر وہ بہت خوش تھا۔ اس نے نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ لی تھی۔ اور اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ بے بی جارج کے جال سے بہت جلد صحیح سلامت بچ نکلے گی۔ خدا نے اس کی آواز ضرور سنی ہوگی۔ اس کو یقین تھا اس لئے بڈھا انکل آج بہت خوش تھا۔ سہ پہر کو جب وہ شہر سے واپس آیا۔ تو چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا، وہاں سے سگار لیا، ماچس لی، اور اپنا پرانا مونڈھا لیے باہر لان پر آ گیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر حسب دستور منہ میں انگلی دے کر سیٹی بجائی۔ جس کو سُن کر آس پاس کے کوارٹروں کے صحن اور باغیچوں میں کھیلنے والے چھوٹے چھوٹے بچے دوڑے آئے اور بڈھے انکل کے قریب گھاس پر بیٹھ گئے۔ پھر زور زور سے تالیاں بجانے لگے

——بڈھاانکل کہانی سناؤ۔بڈھاانکل کہانی سناؤ.....''

''پہلے ایک بات بولے گا۔ پھر کہانی سنائے گا۔اچھا بولو یہ دنیا اتنا بیوٹی فل کیوں ہے؟''

بچوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔سبھوں نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''بابالوگ بولو—''بڈھاانکل نے حیرت سے گھورا۔'بولتا کیوں نہیں؟''

''پر بڈھاانکل مون کدر ہے.....؟''بابالوگ نے یکبارگی کہا۔جسے سن کر بڈھا انکل بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

''ٹھیک بولتا۔ابھی مون کدر ہے.....''پھراس نے چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو دھوپ سے بچانے کے لئے ہاتھ سے سایہ کر کے بے بی کے کمرے کی طرف دیکھا۔جس کی کھڑکی بند تھی۔

''ابھی مون نہیں ہے۔ پر بابالوگ ابھی مون آئے گا۔.....''اور یہ کہتے کہتے ایکا ایکی کچھ سوچ کر وہ اداس ہوگیا۔''اپنا مون پر گرہن لگنا مانگتا ہے.....''

''کیا لگنا مانگتا ہے بڈھاانکل—؟''حیرت سے بچوں نے اس کی طرف دیکھا۔

گرہن—!''وہ چونک اٹھا۔بابالوگ گرہن نہیں جانتا.....؟''

''نہیں جانتا—''

بڈھاانکل یہ جواب سن کر مسکرانے لگا۔''تو آؤ بابالوگ آج گرہن اور مون کا کہانی سنائے گا۔''

خاموش چُپ چُپ ،جیسے ہک صاحب کا بڑا سا خونخوار کتا گردن جھکائے زمین سونگھتا ہوا گزرتا ہے۔کسی کو کچھ نہیں بولتا۔وقت بھی کسی سے بولے بغیر پہلو بچا کر نکل جاتا ہے۔اور جب کبھی کوئی اس کے سامنے آجاتا ہے۔ ہک صاحب کے خونخوار کتے کی طرف اس پر جھپٹ پڑتا ہے۔لہولہان کر دیتا ہے۔اب کوئی اپنا زخم لئے لاکھ چیختا چلاّتا رہے۔ یہ خونخوار کتا پلٹ پلٹ کر دیکھتا تک نہیں۔چپ چاپ گزر جاتا ہے۔

لیکن بے بی تو چیخ بھی نہیں سکتی۔چلاّ بھی نہیں سکتی۔وہ اپنا گہرا زخم کسی کو دکھانے سے

بھی مجبور ہوگی۔ بے بی ..... مائی ڈارلنگ بے بی! تم ٹھہر جاؤ ..... ایسا سرپٹ نہ بھاگو۔ یوں آنکھ بند کر کے دوڑنے سے سڑک پر اوندھے منہ گر بھی سکتی ہو۔ پھر یہ بوڑھا خونخوار کتا تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ ایسا زخمی کرے گا بے بی کہ تم شاید اٹھ کر چلنے کے قابل بھی نہ رہ سکو گی۔ پھر میں بڈھا ـــــ تمہارا بڈھا انکل پورے کرشچن لوکیلٹی کا بڈھا انکل جو تمہارے سڈول اور خوبصورت جسم میں تمہاری ماں کی سوندھی مہک پاتا ہے۔ کیسے زندہ رہ سکے گا۔؟ ٹھہر جاؤ بے بی ٹھہر جاؤ بے بی ..... ٹھہر جاؤ

مگر بے بی نہیں ٹھہری ..... بے بی چلی گئی۔ رات تاریک تر ہو گئی تھی۔ لوکیلٹی کے شیشوں کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر آنے والی بلور روشنی بجھ چکی تھی۔ پھر باغ کے وسیع ویرانوں میں جھینگروں کی آواز گہرے سناٹے کو مسلسل نوچ رہی تھی۔ جیسے گھپ اندھیرے میں جگنو لگاتار ٹمٹمائے جا رہا ہو۔ گویا اکیلے میں دل دھڑکے ہی چلا جا رہا ہو۔ دھک دھک ..... دھک دھک دھک دھک

بڈھا انکل نے بجھے ہوئے سگار کو دانتوں سے نوچ کر ہولے سے تھوک دیا اور بے تاب سا ہو کر دھیرے سے دل پر ہاتھ رکھ لیا ـــــ یہ دل ..... یہ دل کیسا دھک دھک کرتا ہے۔ کیسا دھڑکتا ہے۔ گویا اپنی اکیلی محبت کے پیچھے بوڑھے خونخوار کتے کو منہ پھاڑے دیکھ لیا ہو۔ ٹھہر جاؤ ٹھہر جاؤ ..... تمہارے پیچھے وقت کا بوڑھا کتا سرپٹ بھاگ رہا ہے ..... دور سنسان سڑک پر کانپتے ہوئے سائے نے دوبارہ سیٹی بجائی ..... جسے سن کر بے بی کے کمرے کی کھڑکی کھلی۔ اور ایک دوسرا سایہ دھپ سے بڈھے انکل کی چھاتی پر گرا۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہ سکا۔ اس کے منہ سے آواز تک نہ نکل پائی۔ کوئی دل کے ویرانے میں کراہتا رہا بے بی ٹھہر جاؤ ٹھہر جاؤ بے بی ..... ٹھہر جاؤ ..... مگر بے بی نکل گئی۔ بگٹٹ، جیسے کوئی اسے کھینچے لیے جا رہا ہو۔

پھر رات جو جھاگ کی طرح پورے ماحول پر چھا گئی تھی۔ دھیرے دھیرے نیچے بیٹھنے لگی۔ تب بہت دیر بعد صحن کے ایک گوشے میں اپنے پرانے مونڈھے پر بیٹھے ہوئے بڈھا انکل کے کان میں الجھتی سلجھتی سانسوں کے درمیان کسی کی بے حد دھیمی چال سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کہیں چوٹ تو نہیں آئی بے۔ بی۔ تمہیں کہیں زخم تو نہیں لگا ..... ڈارلنگ .....؟''

دھیمے سے بڈھے انکل کے موٹے اور کرخت لبوں سے آواز نکلی۔ جسے سن کر بے بی جو دھیرے دھیرے کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش میں بار بار پھسل کر زمین پر آرہی تھی۔ سہم کر کھڑی ہوگئی۔ ایک ساعت کے لئے بے بی کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ مگر وہ سنبھل گئی۔ آخر بڈھا ہی تو ہے۔ مفت کی روٹیاں توڑنے والا بیمار کتا ـــــ اس نے آہستہ سے مگر سخت لہجے میں کہا ـــــ ''تم اِدر میں کیا کرتا سور؟''

مٹی کا ایک لوتھا آخر اس ابلتے ہوئے سوتے کے منہ پر پڑا۔ ''کچھ نہیں کرتا بے بی، کچھ نہیں.....!''

''اچھا اچھا اِدر آؤ، امارا ہلپ کرو۔''

''تمارا ہلپ یسوع مسیح کرے گا۔ بے بی.....'' بڈھا انکل اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''اوہ بڈھا! تم ایسا ماپھک بات کرتا۔ امارا ہلپ کرو۔ ام اوپر جانا مانگتا۔''

بڈھے انکل نے کچھ نہیں کہا۔ ایک روتی بلکتی ہوئی نظر سے اس نے بے بی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کھڑکی کے نیچے بیٹھ گیا۔ بے بی جلدی سے جوتے سمیت اپنے دونوں پاؤں اس کے کندھے پر رکھ کر کھڑکی کے نیچے کود گئی۔

یہ پاؤں..... یہ پھول سے پاؤں..... کتنے بھاری لگے آج، جیسے وہ منوں مٹی کے نیچے دھنس رہا ہو۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بے بی پانچ کا ایک نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھماتی ہوئی مسکرائی ـــــ ''پانچ کہتا، تم بہوت اچھا بڈھا ـــــ بہوت وفادار.....''

''پر بے بی ایک بات بولنا مانگتا۔''

''کیا؟ بولو.....'' اس کے تیور چڑھ گئے۔

بڈھے انکل کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے انگلیوں میں کانپتے ہوئے نوٹ کو کھڑکی پر آہستہ سے رکھ دیا۔ ایک بار بے بی کو نظر اٹھا کر دیکھا اور چپ چاپ وہاں سے ہٹ گیا۔

کچھ نہیں بولنا مانگتا..... کچھ نہیں.....''

بے بی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڈھا آخر کیا چاہتا ہے۔ نہ معلوم کب سے برآمدے میں شاید اسی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے روپیہ نہیں لیا وہ کچھ بولتا بولتا بھی رہ

گیا۔ وہ آخر کیا کرنا چاہتا ہے۔.....؟ پہلی بار اس کے دل میں بڈھے انکل کے لئے کچھ نرمی سی محسوس ہوئی ——— پپا کہتے ہیں بڈھا انکل بہوت اچھا آدمی ہے..... بڈھا نہیں ہوتا تو وہ شاید کھڑکی پر چڑھ بھی نہیں سکتی ——— لیکن بڈھا کیا بولنا چاہتا ہے.....؟

''بڈھا تم کمرے میں ہے.....؟'' دوسرے روز شام کو مارگریٹ بڈھے انکل کے دروازے پر کھڑی تھی۔

آفتاب کہیں ڈوب گیا ——— دھندلکا پھیل رہا تھا۔ آس پاس کی چیزیں رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ کمرہ کافی تاریک تھا۔ بڈھے انکل نے صبح سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ وہ اوندھا منہ بستر پر یوں پڑا ہوا تھا۔ گویا اس کے جسم پر بھاری بوجھ رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور دل دھڑکتے دھڑکتے تھم سا جاتا تھا۔ پھر اس نے محسوس کیا گویا اسے بہت دور سے پکار رہا ہو۔ جیسے بے بی کے پپر کو بوڑھے کتے نے جبڑوں میں دبالیا ہو۔ اور وہ بیچاری چیخ بھی نہ سکتی ہو..... کسی کو پکار بھی نہ سکتی ہو..... بڈھا تم کدر ہے..... بڈھا تم کدر ہے.....

''بڈھا تم کدر.....؟''

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ——— سامنے کھڑے بے بی اس سے کچھ پوچھ رہی تھی ——— کون بے بی..... تم ام کو مانگتا بے بی..... وہ..... وہ ہک صاحب کا کتا تم کو کدر میں کاٹا.....؟ بولو ام اس کو جان سے مار ڈالے گا۔ کِدر.....''

مارگریٹ ہنس پڑی۔ ——— کدر میں کتا کاٹا..... یو بڈھا پاگل تم کو کون بولا۔ ام کو ہک صاحب کا کتا کاٹا.....'' وہ اندر چلی آئی ہوش سنبھالنے کے بعد غالباً پہلی بار بے بی اس کے کمرے میں آئی تھی۔ بڈھا انکل بے تابی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے فلیٹ سے مونڈھے کو صاف کیا۔ سوئچ دبا کر بتی جلائی بے بی تم اِدر میں بیٹھو..... بے بی، کل رات اَم یسوع مسیح کو بولا۔ بے بی کو ایک بار بھیج دو۔ تم پھر ابھی ایوننگ کو یسوع مسیح نے تم کو اما را پاس ٹاک کرنے کو بھیج دیا.....!''

بے بی اُکتا گئی..... کمرے میں چاروں طرف ایک عجیب سی بدبو پھیل رہی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا ——— بڈھا تم بہوت بات کرتا۔ تھوڑا بولو ———

کل رات میں تم کچھ بولنا مانگتا.....؟

ہاں بے بی، کل رات میں ام کچھ بولنا مانگتا..... بے بی اپنا لوکیلٹی کا لمبا سڑک دیکھا۔ اس پر کتنا جیپ جاتا، کار جاتا ـــــ صائب لوگ اور میم صائب لوگ واک کرتا..... پر بے بی اپنا دل کوئی لوکیلٹی کا سڑک نہیں۔ اس پر سے کوئی جاتا تو بہوت تکلیف ہوتا۔ بہوت تکلیف..... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے..... ''بائی گاڈ بے بی بولتا، بہوت تکلیف ہوتا.....!''

بڈھا انکل، تم کو فیور ہے تم آرام کرو ـــ امارا ٹائم برباد مت کرو۔ ام جاتا.....''

''نہیں بے بی..... ٹھہرو ذرا..... ٹھہرو..... بائی گاڈ ام جھوٹ نہیں بولتا۔ یسوع مسیح جانتا جب جارج..... جارج اپنا دل پر سے گزرتا تو ام کو بہوت تکلیف ہوتا۔ ایسا ماپھک ـــــ ''اس نے سینے پر زور سے گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

مارگریٹ سمجھ گئی۔ ''بڈھا کمینہ..... دفعتاً وہ چراغ جو کل رات پچھلی پہر بڈھا انکل کے نوٹ واپس کرتے وقت جل اٹھا تھا۔ اچانک بھڑک کر بجھ گیا..... بڈھا کمینہ! تم امارا پرسنل بات میں کیوں ٹانگ اڑاتا ہے..... کتا ام تمارا آنکھ پھوڑ دے گا..... سور.....''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں سچ بولتا بے بی! جارج اچھا نہیں، بہوت خراب، ام جانتا اپنا رابرٹ صائب کی بے بی کو خراب کیا..... وہ کتا..... سور..... بے بی اس کا ساتھ چھوڑ دو..... وہ کتا.....''

تڑپ کر مارگریٹ نے ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر جڑ دیا ـــــ کمینہ ـــ!''

بڈھا انکل تھپڑ کی تاب نہ لا کر فرش پر گر گیا۔ سچ بولتا، بائی گاڈ بے بی سچ.....''

مارگریٹ نے زور سے ایک لات رسید کی اور گالیاں دیتی کمرے سے نکل گئی۔

پھر بڈھے انکل نے جو دن بھر بخار میں سلگ رہا تھا۔ یوں محسوس کیا کہ دیوار پر لگا ہوا بلب دھیرے دھیرے مدھم ہو کر بجھ گیا۔ اور وہ خود فرش کے نیچے ڈوبتا چلا گیا..... ڈوبتا ہی چلا گیا..... پھر بہت دیر بعد وہ فرش کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھرا تو اس وقت آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ سرد ہوا کے تیز جھونکے باہر درختوں کے پتوں سے اُلجھ اُلجھ کر گزر رہے تھے۔ اور وہ

اکیلا کمرہ میں پسینے میں شرابور فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے گال پر سے ابھی تک وہ جلتا ہوا توا چمٹا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس پر ہاتھ پھیرا..... بے بی تم ام کو مارا..... بے بی تم ام کو تھپڑ مارا ایسا ماپھک مارا..... بڈھا انکل کی آواز رندھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر یوں رونے لگا جیسے بے بی کی ماں آج پھر مرگئی ہو۔ جیسے پرانی میم صاحب جو دل کے کسی گوشے میں پڑی کراہ رہی تھی آج پھر مرگئی ہو۔ بے بی تم ام کو مارا..... اپنا بڈھا انکل کو مارا..... کمرے میں اُس کی سسکیاں بھٹکی ہوئی روح کی طرح پھر رہی تھیں..... وہ اسی حالت میں اٹھا۔ لکڑی کے بڑے سے صندوق میں سے پھٹے پرانے کپڑے، پرانی بے کار فل بوٹ اور ٹوٹے ہوئے چمڑے کے بیلٹ کے نیچے سے ایک میلے کپڑے کی پوٹلی نکالی۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں ریشم کے دو پینٹ، چھوٹے چھوٹے فراک، ایک پلاسٹک کا تڑا مڑا جھنجھنا اور دو تین ربر کی شہد والی چوسنی نکال کر باہر پھیلا دیں اور ایک ایک چیز کو اُٹھا کر آنکھوں سے لگاتا جاتا اور پھوٹ پھوٹ کر روتا جاتا..... بے بی تم ام کو مارا..... بے بی ڈارلنگ تم اپنا..... بڈھا انکل کو مارا..... تھپڑ مارا.....

تھوڑی دیر بعد آپ ہی آپ چپ ہوگیا۔ پوٹلی کو اسی طرح باندھ کر صندوق میں رکھا۔ پھر اس نے میلی قمیض کی آستین سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ فلٹ کو جھاڑ کر سر پر رکھ لیا۔ طاق سے ماچس اور ایک بہت پرانے ڈبے سے اگربتی نکالی اور دھیرے سے یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ سارا بوجھ جو بہت دیر سے اس کے شانے پر پڑا تھا زمین کے سپرد کر کے سبکدوش ہوگیا ہو.....

"یسوع مسیح! بے بی نے ام کو مارا اس کو معاف کرو، بے بی اپنا..... بڈھا انکل کو مارا اس کو اسکیوز کرو۔ یسوع مسیح وہ کچھ نہیں جانتا، ایک دم سے بے بی ہے....."

اس کے کانپتے ہوئے قدم آپ ہی آپ علاقے کے بیچ در بیچ گلیوں کو عبور کرتے ہوئے آدھی رات کے سناٹے میں ڈوبے ہوئے قبرستان میں لے آئے پھر وہ ایک جگہ رک گیا۔ اور ایک بہت پرانی قبر کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے پیچھے بیٹھ کر اگربتی جلائی۔ پھر اپنے گال پر ہاتھ پھیرنے لگا۔" ..... میم صائب سچ بولتا..... اپنا بے بی آج امارا گال پر مارا..... بائی گاڈ مارا ....." پھر وہ رونے لگا۔ ام اس دنیا میں نہیں رہنا مانگتا..... میم صائب اب اس دنیا میں ام نہیں رہنا مانگتا۔ ام تمارا پاس آئے گا..... تم ام کو اپنا پاس بلالو..... بے بی بولتا، امارا

پرسنل بات میں ٹانگ مت اڑاؤ..... وہ ام کو سور بولتا، کتا بولتا۔ یسوع مسیح اس کا بلپ کرے.....
وہ اب بہت بڑا ہو گیا میم صائب..... اب اس کو امارا ضرورت نہیں ذرا بھی ضرورت نہیں.....
.....اب ام اس کا پرسنل بات میں ٹانگ نہیں اڑائے گا..... اب اپنا بے بی بہوت بڑا ہو گیا
..... اب کبھی نہیں ڈسٹرب کرے گا..... بائی گاڈ کبھی نہیں ڈسٹرب کرے گا.....''

پھر بہت دیر ہو گئی۔ اور رات کی سرد ہوا اُس کی ہڈیوں میں گھس کر سیٹیاں سی بجانے لگیں۔ تو بڈھے انکل نے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھی پھر انگلیوں سے سینے پر صلیب بنائی اور سردی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے آنسو خشک کرتا اور منہ ہی منہ میں بدبداتا گھر واپس آ گیا—— اب کبھی نہیں ڈسٹرب کرے گا..... اپنا بے بی بہوت بڑا ہو گیا۔ اس کو امارا کوئی ضرورت نہیں اب کبھی نہیں کچھ بولے گا..... یسوع مسیح! اس کا بلپ کرو۔''

سات دنوں تک سیاہ آندھیاں اور جھکڑ چلتے رہے۔ تیز اور سرد آندھیاں.....
سات دنوں تک وہ بخار کی شدت میں تڑپتا رہا۔ اور خداوند یسوع سے دعا کرتا کہ آندھیوں کی زد میں جلتا ہوا چراغ بجھ جائے۔ مگر چراغ نہیں بجھا..... سات دن تک اور چراغ کی ڈوبتی ابھرتی لَو تھرتھراتی رہی..... تھرتھراتی رہی.....

اور اب کئی مہینے ہو گئے۔ وہ دن بھر چپ چاپ کمرے میں اوندھے منہ بستر پر پڑا رہتا۔ آنکھیں کھولے اور دیوار کو تکتا رہتا۔ وہ اب ہر صبح نہا دھو کر صاحب اور میم صاحب کو گڈ مارننگ کہنے نہیں جاتا۔ بلکہ ہفتے دو ہفتے میں ایک آدھا جام اور ضرورت کی چیزوں کے لئے پیسے لے کر گردن جھکائے واپس چلا آتا حتیٰ کہ خواہش ہونے پر بھی خلاف معمول بے بی کے کمرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا علاقے کے لوگوں کو تعجب ہوتا کہ اب بڈھا انکل، ٹھہر ٹھہر کر چلنے والا، ڈھیلے ڈھالے پتلون اور میلے فلیٹ پہنے ہوئے۔ بڈھا انکل جو راستہ طے کرتے وقت ہر آنے جانے والے صاحب کو گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ کہنے سے نہ چوکتا تھا۔ اب یوں گردن جھکائے ہوئے سامنے سے گزر جاتا ہے گویا وہ یہاں کا رہنے والا ہی نہ ہو۔ بعض لوگ بڈھا انکل کہہ کر اسے پکار بھی لیتے تو آہستہ سے گردن اٹھا کر مسکرا دیتا۔ اور پھر ٹھہر ٹھہر کر چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ جاتا..... صاحب کو تشویش ہوئی۔

''بڈھا انکل تمارا طبیعت اچھا نہیں رہتا؟''

''نہیں صائب، اچھا رہتا ہے ام سرونٹ ہے، سرونٹ ماپھک رہتا!!''

پھر جس دن اس کے سامنے سے نئی میم صاحب گزر گئی اور اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کرنے کی بجائے گردن جھکا کے حسب دستور جوتے سے میل اتارتا رہا تو نئی میم صاحب بگڑ گئیں۔

''یو بلاڈی بڈھا، تم ام کو اب سلام بھی نہیں بولتا۔ بڈھا تم کتا..... سور..... بالکل سور.....''

بڈھا انکل آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا'' سچ بولتا میم صائب ام کتا ام سور.....'' اس نے سر سے فلیٹ اتار لی اور جھک کر سلام کیا۔ یہ سور تم کو سلام بولتا میم صائب، ام سے بھول ہوا..... .....ام کو اسکیوز کرو۔'' یہ کہتا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اس کی بے حسی بڑھتی گئی..... بڑھتی گئی۔ تہ در تہ گویا سیمنٹ کا پلاسٹر چڑھایا جا رہا ہو۔ اور اس پلاسٹر کے اندر سے بڈھے انکل کی کیچ بھری آنکھیں ٹکر ٹکر تک رہی تھیں۔ بے حس، بے اثر..... سرد اور بے جان آنکھیں..... .....اس کی بے حسی بڑھتی گئی..... بڑھتی گئی..... اور اچانک اس رات تڑخ گئی جس رات ڈرائنگ روم سے بے بی کی چیخوں کی آواز مسلسل آتی رہی۔ اور اس کے احساس پر نشتر چبھوتی رہی، اس رات وہ تڑپ اٹھا۔ وہ بے تابانہ اٹھ کر دہلیز تک گیا۔ پھر کچھ یاد کر کے واپس آ گیا۔ ''نہیں، سرونٹ کو نہیں بولنا چاہیے۔ نہیں یہ ان کا پرسنل بات ہے۔ اس میں دخل نہیں دینا چاہیے..... مگر بے بی؟ بی بی چھ سالہ بچوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اور گڑگڑا کر پپا اور ممی سے معافی مانگ رہی تھی۔ ''نو پپا..... نو پپا..... اسکیوزمی..... پپا پپا.....''

بڈھا انکل کے قدم رک گئے..... پپا پپا..... گویا بے بی بہت دور سے انیس برس کی دوری سے اسے پکار رہی ہے..... نو پپا، نو پپا..... اسکیوزمی اسکیوزمی..... پپا پپا..... مائی پپا..... بڈھا انکل کے لب ہولے ہولے کانپنے لگے..... دھواں کی طرح پیچ کھائی ہوئی ایک الجھتی ہوئی آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر اس کے حلق میں پھنس پھنس جاتی تھی..... اس کے لب ہل رہے تھے۔

''پپا پپا..... مائی پپا.....'' گویا ہک صاحب کا کتا، بے بی کی نازک ٹانگ کو اپنے جبڑے میں دبائے ہوئے ہے۔ اور وہ زور سے اسے پکار رہی ہو۔

پھر وہ اچانک پلٹ پڑا............ "بے بی..... ای ای..... ام آتا ہے بے بی..... مائی بے بی......" برسوں کی دبائی ہوئی آواز اس کے حلق سے یوں نکلی گویا آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑا ہو۔ وہ لپکتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے پر آکر رک گیا۔ پھر دوڑتا ہوا صاحب کے سامنے جھک کر کھڑا ہوگیا۔ "نہیں صائب! نہیں صائب!! بے بی کچھ نہیں جانتا............ ام بولا وہ جارج کتا............ وہ جارج سور............"

صاحب نے بید دور پھینک دی— "بڈھا، تم جاؤ ابھی............ فوراً جاؤ............ ابھی ام نہیں مانگتا............"

"جاتا صائب............ ابھی جاتا............" بے بی اس کے سامنے اوندھے منہ فرش پر پڑی سسک رہی تھی۔ اس میں رونے تک کی سکت نہیں تھی۔ بڈھا انکل نے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا............ جاتا ہے صائب، پر بے بی کو اب نہیں مارو صائب۔ بے بی کچھ نہیں جانتا............ یسوع مسیح جانتا اپنا بے بی ایک دم اچھا والا............"

ام بولتا سور تم روم سے باہر جاؤ............ فوراً نکل جاؤ۔"

"ابھی جاتا صائب............ ابھی جاتا............" اس نے پھر ایک بار بے بی کے جسم پر ہاتھ پھیرا............ پھر وہ ایک ساعت کے لئے کھوگیا۔ بھٹکتا ہوا بہت دور نکل گیا............ جہاں اُفق اور زمین آپس میں مل جاتے ہیں۔ اور بجز ایک موٹے کچے بید سے کچلے ہوئے جسم کے ہر چیز نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ پھر بڈھا انکل نے چونک کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بڑے آہستہ سے جیسے گلاب کی پنکھڑیوں سے شبنم چن رہا ہو۔ ہتھیلی کو اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر اپنے بستر پر گر کے رات بھر یوں تڑپتا رہا گویا صاحب نے بے بی کو نہیں پرانی میم صائب کو مارا ہو گویا اس کے دل کے نازک ترین حصے پر مسلسل بید کی بارش کردی ہو............ نہیں صائب............ نہیں صائب— اب نہیں...... اب نہیں............!"

دوسرے دن صاحب دوپہر میں خود بڈھا انکل کے کمرے میں آیا۔ اور رات کے سلوک کے لئے معافی مانگی۔ ام کو معاف کردو بڈھا انکل............ تم سچ بولتا جارج سور...... وہ بالکل سور............ ام اس کو شوٹ کردے گا۔............ وہ کتا یہاں سے بھاگ گیا۔ پر اپنا بے بی کا کلکتے میں ایک لڑکا کے ساتھ پکا کیا۔ لڑکا بہت اچھا

..... وہ چار سو روپے پاتا..... اور وٹسن صائب کا وائف کا انٹی ہوتا۔ اس کو کیس معلوم ہو جانے سے امارا عزت مٹی میں مل جاتا..... وہ لڑکا ایک مہینہ بعد اِدر میں آنے کو مانگتا..... پر بے بی..... وہ رونے لگا..... بے بی نے امارا منھ پر کیسا ماپھک تھپڑ مارا۔ بولو..... کیسا ماپھک تھپڑ مارا.....'' وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ بڈھا انکل کی آنکھوں سے بھی جھر جھر آنسو گرنے لگے۔

پھر اس کے بعد وہ قہر کی رات بھی آئی۔ جب فسادات کی وجہ سے سارے شہر میں کرفیو نافذ تھا۔ اور نادان بے بی ایک ناجائز بچے کو جنم دے رہی تھی۔ اور فطرت کی طرف سے شاید یہ سب سے بڑی سزا تھی کہ میز پر وہ تار بھی پڑا ہوا تھا۔ جس میں بے بی کے ہونے والے شوہر نے کلکتہ سے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔

بڈھا انکل نے دوسری بار محسوس کیا کہ آج کی رات اس بے مصرف دنیا کی آخری رات ہے۔ اور کل کے بعد شاید کوئی زندہ باقی نہ بچے گا۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں چمکتا ہوا خوبصورت چاند کبھی بادل میں ڈوب جاتا کبھی ابھر آتا..... بڈھے انکل کے دل میں آیا کہ وہ آس پاس کے بنگلوں میں سوئے ہوئے بچوں کو جھنجھوڑ کر اٹھائے اور ایک ایک سے پوچھے کہ دنیا اتنا بیوٹی فل کیوں ہے؟ اور جب بچے مون کی طرف اشارہ کر دیں تو ان سے یہ بھی پوچھ ڈالے کہ بابالوگ اگر آج اپنا مون کو گرہن لگ گیا تو.....؟

''بابالوگ بولو.....؟''

''بابالوگ..... بابا..... لو.....''

''کیا بولتا بڈھا انکل؟''

''کچھ نہیں صائب..... کچھ نہیں.....'' وہ اٹھ کھڑا ہوا..... ام بابالوگ سے پوچھتا اپنا مون وہ بادل میں ڈوب گیا تو پھر کیا ہوگا۔ ام اس اندھیرا دنیا میں بابالوگ کو کدر سے کنگ کا کہانی سنائے گا۔ کیسا پھک کہانی سنائے گا صائب.....؟''

''ابھی ایسا ماپھک مت بولو انکل..... ابھی کچھ نہیں بولو..... ابھی آسنسول سے صاحب کا فون آیا۔ وہ بولا۔ اور میں رابسن صاحب کلکتہ سے آیا۔ اِدر میں کرفیو ہے۔ وہ کل مورننگ کو آئے گا..... کل مورننگ..... تم امارا ایک کام کرو بڈھا انکل..... ام تمارا بہوت

تھینکس بولے گا۔..... بائی گاڈ اپنا بے بی کے لائف کے واسطے ایک کام کرو..... کرے گا انکل؟

کرے گا صائب..... اپنا بے بی کے لائف کے واسطے اپنا لائف دے دے گا بولو صائب..... ضرور کرے گا.....''

''امارا ساتھ اوپر آؤ.....'' صاحب نے عجیب نظروں سے ایک بار بڈھا انکل کا جائزہ لیا اور اوپر چلا گیا۔ ''اِدر آؤ بڈھا انکل.....''

بڈھا انکل سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

پھر جب اس نے صاحب کے حکم کے مطابق گندے خون آلود چیتھڑے میں لپٹے ہوئے مردہ بچے کو میز سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا تو ایسا لگا جیسے ایک بھاری بوجھ اس کے ہاتھوں میں آپڑا ہو۔ پھر یکا یک اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ اور دھڑک کر اچانک رک گیا۔ گویا اس نے مارگریٹ کے جسم کو نوچ کر یہ لوتھڑا الگ کر لیا ہو۔ انیس برس قبل جب اس نے بے بی کے گرم جسم کو اپنے بازوؤں پر لیا تھا تو اس کے سارے جسم میں ایک گرم لہر دوڑ گئی تھی۔ اس کی گردن فخر سے تن گئی تھی۔ پھر اس نے یوں محسوس کیا تھا جیسے ساری دنیا اس کے توانا بازوؤں میں آلیٹی ہو..... ایک گلاب کے پھول کی طرح ہلکی ہو کر، خوبصورت ہو کر..... مگر آج یہ بوجھ کتنا بھاری ہے ..... آج کی دنیا کتنا گراں بار ہو گئی ہے..... اُنیس برس میں اس پھول کی طرح نرم و نازک دنیا کا وزن کتنا بڑھ گیا ہے..... اس نے آہستہ سے لوتھڑے کو میز پر رکھ دیا۔ ''نہیں صائب! ام اتنا بھاری نہیں اُٹھا سکے گا..... اپنے پاس اتنا طاقت نہیں..... نہیں اُٹھا سکے گا۔!''

پھر صاحب جو بڈھا انکل کو حیرت سے تک رہا تھا۔ بدحواس ہو گیا۔ اور اس نے لپک کر بے اختیارانہ طور پر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''مارننگ میں رابسن صاحب آتا..... ''وہ بہت دیر تک بڈھا انکل کے پاؤں پکڑے۔ اسے اونچ نیچ سمجھاتا رہا..... ''اپنا بے بی..... اپنا بے بی کتا ماپھک مرجائے گا اپنا بے بی..... اپنا بے بی.....''

''اپنا بے بی.....''

''اپنا بے بی..... کتا ماپھک مرجائے گا..... کتا ماپھک مرجائے گا..... کتا ماپھک''

جیسے پرانی میم صاحب بہت دور سے گھگھیا رہی ہو— "اپنا بے بی....... اپنا بے بی....... کتا ماپھک مر جائے گا......."

اس نے ہڑبڑا کر میز سے لوتھڑے کو اٹھا لیا......... "نہیں....... نہیں ایسا ماپھک نہیں مرے گا۔"......... اس نے اپنے سینے پر صلیب بنائی......... "ایسا ماپھک کبھی نہیں ہوگا...... یسوع مسیح امارا ہلپ کرو........" وہ تڑپتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں صاحب نے اسے روک کر پھر تاکید کی——

"اِدر سے نہیں انکل، اُدر پولیس ہوتا......... اس طرف سے" صاحب نے پچھواڑے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں لوکیلٹی کے گندے پانی بہنے کے لئے ایک بڑا سا نالہ بہت دور نکل گیا تھا۔ "اور اتنا دور پھینک آؤ کہ لوکیلٹی سے بہوت دور......."

یہ قہر کی رات یہ ہو کا عالم......... بڈھے انکل نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی اور بلا کا سناٹا چھا رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ دل مسلط تھے۔ گندے نالے کے کنارے کنارے چلتا ہوا جب کرفیو کی اس بھیانک رات میں پولیس کی نگاہوں سے بچتے بچاتے شہر کے حدود اربعہ میں قدم رکھا تو سرد ہوا کے تیز جھونکوں کے باعث اس کی پنڈلیاں برف کی طرح سل ہو رہی تھیں۔ دل دھڑک رہا تھا اور اس کے بازو پر پڑا ہوا بوجھ لحہ بہ لحہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک جھاڑی کے کنارے اس لوتھڑے کو رکھ دینا چاہا......... لیکن کل پولیس کی نظر پڑ گئی....... اور وہ لوکیلٹی میں پوچھتا پوچھتا آ گیا تو.........؟ ولسن صاحب کی بیوی ضرور اشارہ کر دے گی......... پھر بے بی!

عین اسی وقت ٹارچ کی تیز روشنی اس کے جوتے کو چھوتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا خاردار جھاڑیوں میں لڑھک گیا......... ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر اُس کے اِرد گرد گھوم پھر کر سفید خون آلود چیتھڑے پر رک گئی......... پھر بجھ گئی......... ذرا توقف کے بعد پھر جل اٹھی اور چیتھڑے پر جمی رہی......... بڈھا انکل کا دل دھڑک کر پھر اچانک رک گیا۔ اس کی سانس تھم گئی۔ اور اس کا سارا وجود کھینچ کر گویا آنکھوں میں آ گیا ہو......... بتی بجھ چکی تھی......... اور قریب کی واٹر ٹنکی کے نزدیک بیٹھے ہوئے سپاہیوں کے درمیان مکھیوں سی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی تھی۔ لیٹے لیٹے بڈھا انکل نے لوتھڑا کو پکڑا، جیب سے اپنا سفید رومال نکال کر وہاں رکھ دیا۔ اور

لیٹا لیٹا کانٹوں پر سے گزرتا گندے نالے کے کنارے کنارے رینگتا ہوا کچھ دور نکل گیا۔

دس قدم چلنے کے بعد پھر ٹارچ کی تیز روشنی آئی اور اس کے سارے جسم کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ وہ ہڑبڑا کر زمین میں جھک کر دوڑنے لگا۔ جیسے کوئی جانور تیزی سے بھاگ رہا ہو۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

''کون ہے..... کون آدمی ہے؟'' ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی نے چیخ کر کہا۔

بڈھا انکل کے قدموں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

کون آدمی ہے..... ٹھہر جاؤ..... ٹھہر جاؤ..... ورنہ شوٹ کر دیئے جاؤ گے''

اس کے پاؤں اچانک تھم گئے۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا تپتا ہوا سا اس کی کنپٹیوں سے چھوتا ہوا نکل گیا۔ جس کے باعث اس کی کنپٹیاں پسینے سے بھر گئیں۔ مگر بے بی..... بے بی.....!

وہ بے اختیاری طور پر دوڑ پڑا..... دوڑتا گیا.....

دور سے پھر آواز آئی..... ''کون سور کا بچہ دوڑتا ہے۔ ام ابھی شوٹ کر دے گا۔

..... ٹھہر جاؤ..... وَن!''

لیکن بڈھا انکل لوتھڑے کو سینے سے لگائے بہ دستور دوڑتا گیا۔

''ٹو!''

اس کے پاؤں سُست پڑے..... سارے جسم میں چنگاریاں سی دوڑ گئیں۔

''تھری!!''

وہ پھر جھکے جھکے جانوروں کی طرح تیزی سے دوڑنے لگا۔ عین اسی وقت تڑاخ ایک آواز خاموش فضا میں ابھری۔ اور اس کی بائیں پنڈلی میں دہکتا ہوا ایک انگارہ گھس گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رکی۔ پھر لمحہ میں وہ انگارہ اس کے سارے جسم میں یہاں سے وہاں تک دوڑتا ہوا پھر بائیں پنڈلی میں آ کر پھنس گیا۔ ایک ساعت میں سب کچھ ہو گیا۔ سارا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ مردہ بچہ ہاتھ سے گر پڑا۔ آندھیوں کی زد میں رکھا ہوا چراغ بجھنے لگا..... تھر تھرانے لگا۔ یسوع مسیح..... یسوع مسیح..... اپنا بے بی.....'' پھر اچانک اس نے اپنے آپ کو سنبھالا..... گندے کپڑے میں لپٹے ہوئے بچے کو لپک کر اٹھا لیا..... بائیں پنڈلی پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ پھر دھیرے سے گندے نالے میں اتر گیا۔ نالے میں کسی نے خاموشی سے اس کے وجود کو

تھام لیا۔ جیسے اس کا وجود اچانک روئی کے گالے میں بدل گیا ہو۔ کوئی اُکھڑتی ہوئی گرم سانس
اس کے چہرے کو چھو گئی، کوئی جانے پہچانے ہاتھوں نے اس کے جسم میں پتہ نہیں کہاں سے بلا کی
طاقت بھر دی بڈھا انکل نے نظر اٹھا کر دیکھا.............. تقریباً تین فرلانگ کے بعد نالہ بائیں
طرف مڑ گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے سینے پر صلیب بنائی۔۔۔ ''یسوع مسیح امارا ہلپ کرو..............
یسوع مسیح ام کو تھوڑا دیر بعد موت دینا۔ ابھی اپنا بے بی کا آخری کام کرتا.............. ابھی نہیں مرنا
مانگتا..............'' پھر اس نے بچے کے چیتھڑے کو زخم میں بھر لیا اور تیزی سے نالے میں بائیں طرف
گھسٹنے لگا۔ جب کافی دیر ہو گئی اور اس نے تین فرلانگ طے کر کے موڑ کے قریب پہنچا جہاں نالے
کے اوپر تھوڑی دور تک پُل کے لئے لمبے لوہے کی شیٹ ڈال دی گئی تھی تو عین اس شیٹ پر چند مسلح
سپاہیوں کو دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ اس چدرے کے نیچے نالہ انتہائی تنگ ہو گیا تھا۔ گندہ پانی چھل چھل
کرتا اس کے جسم کو بھگوتا ہوا گذر رہا تھا۔ لوہے کے چدروں پر بھاری بوٹوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔
اور اس کا جسم رفتہ رفتہ اپنی طاقت کھو رہا تھا۔ سردی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اس کا جسم برف کی سِل کی
طرح سرد ہوتا جا رہا تھا۔ گردن آہستہ آہستہ ایک طرف کو جھولنے لگی.............. اوپر بوٹوں کی آواز
رک گئی۔ پھر دھیرے دھیرے یوں کئی منٹ گزر گئے۔ اسے احساس تک نہ ہوا۔ پھر بڈھے انکل
کے قریب بے بی مارگریٹ اوندھی فرش پر پڑی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی.............. نو پپا.............. نو پپا
.... اسکیوزمی.............. پپا.............. پپا !!! اس نے بڑبڑا کر بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھول
دیں۔ زور سے گردن کو جھٹکا دیا۔ گندہ پانی کافی جمع ہو گیا تھا۔ جواب اس کی گردن کو چھوتا ہوا گزر
رہا تھا۔ تھوڑی سی جگہ میں کپڑے میں لپٹا ہوا مردہ بچہ سطح پر چکر کاٹ کر اس کی ٹھوڑی سے ٹکرا
رہا تھا.............. گویا اس کے ہاتھوں سے نکل بھاگنا چاہتا ہو۔ اس نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ عین
اسی وقت اوپر آئرن شیٹ پر کئی جوتوں کی آواز اُبھری چچ چچ.............. چچ چچ.............. چراک..............
.... چراک چچ چچ.............. جیسے کوئی اس کے سر پر چل رہا ہو.............. پھر آواز رک گئی اور اوپر سے
باتوں کی آواز آنے لگی۔ بڈھا انکل نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس تنگ راستے میں گھسٹتا گھسٹتا
گھوم گیا.............. دم سادھے نالے کے اس موڑ کو عبور کر کے وہ باہر پھیلاؤ میں آیا۔ تو اس کا دل
اچانک ڈوبنے سا لگا۔ پانی میں شرابور کپڑے اسے بہت بھاری معلوم ہوئے۔ قریب ایک بھاری
پتھر پڑا تھا۔ بڈھا انکل نے اس پتھر کو آہستہ سے ہٹایا۔ اس کے نیچے کی مٹی گیلی تھی۔ دھیرے

دھیرے اس نے گیلی مٹی کو ہٹا کر ایک گڈھا سا بنایا۔ چھوٹے سے بچے کو گڑھے میں رکھنے سے پہلے چیتھڑا ہٹا کر اس نے چہرہ دیکھنا چاہا..... مگر رات بے حد تاریک تھی۔ اندھیرا بے حد گھنا تھا۔ اس کی آنکھیں اس گھپ اندھیرے میں پتھرا کے رہ گئیں۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنی انگلیاں مردہ بچے کے چہرے پر پھیرنا شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ دل کے ویرانے میں پھول سے کھلنے لگے۔ گویا اُنیس برس قبل والی ننھی مارگریٹ اُس کی گود میں ہو اور وہ موم کے سرخ گالوں پر انگلیاں پھیر رہا ہو..... پھر اچانک بائیں ٹانگ میں ایک ٹیس اٹھی اور اس کے جسم کی ساری رگوں کو کھینچتی ہوئی نکل گئی۔ بڈھے انکل نے جلدی سے بچے کو گڑھے میں رکھ کر اس پر سے چٹان رکھ دیا۔ اور وہ چٹان جو دو تین گھنٹے سے اس کے وجود کو کچلے ہوئے تھی۔ آپ ہی آپ اُتر گئی۔

''بائی گاڈ اب ام مرنا مانگتا..... ایک دم مرنا مانگتا..... یسوع مسیح۔ مگر وہ پھر رُک گیا..... ''لیکن ادر میں نہیں..... اُدر میں اپنا روم میں..... اپنا روم میں..... اپنا روم میں..... اپنا بے بی کے سامنے میں.....!''

وہ لپکتا ہوا نالے کے کنارے چلنے لگا..... پھر ایک بڑے سے پتھر کا سہارا لے کر باہر آ گیا..... اور داہنی طرف علاقے کے بنگلوں کی کیاریوں کے کنارے کنارے چلتا اپنے آپ کو پولیس سے چھپاتا ہوا صاحب کے بنگلے کے گیٹ پر آیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے اپنی زخمی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا اسی وقت بڑی زور کی اُبکائی آئی جسے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر روکنا چاہا مگر اندر سے گرم گرم پانی کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے اُبل ہی آئے۔ سر چکرایا پھر زور سے ایک بار قے ہوئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا..... پھر بڈھے انکل نے محسوس کیا گویا نالے کا گندہ پانی اس کے اوپر سے گزرنے لگا ہو۔ اور مردہ بچہ چیتھڑے میں لپٹا ہوا اس کے سر کے پاس ناچ رہا ہو۔ اور وہ اس کے نیچے پیاس کی شدت سے تڑپ رہا ہے۔ اس کے حلق میں آگ سی لگنے لگی۔ پھر وہ سو گیا۔ بڑی گہری نیند سو گیا۔

بہت دیر بعد وہ جاگا تو اس نے دیکھا نالے کا گندہ پانی گزر گیا ہے اور وہ گہری تاریک رات..... وہ قہر کی رات..... آخری رات بھی گزر چکی ہے..... اور وہ مرا نہیں، بدستور زندہ ہے۔ ڈاکٹر نے تیسرا انجکشن دیا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

''بڈھا انکل، اب کیسا ہے؟''

اپنا بے بی کیسا ماپھک ہے صائب.....؟اپنا بے بی کو بک صائب کا کتا کاٹا.....
.....بائی گاڈ ام کو بھی کاٹا اور دیکھو.....اس نے اپنی زخمی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جو سفید پٹیوں سے بندھی ہوئی تھی۔.....''دیکھو اِدر میں کاٹا''

''اپنا بے بی اچھا ہے.....بڈھا انکل تم دودھ پیو.....''اس نے گلاس بڑھایا۔تم کو کوئی کتا نہیں کاٹا.....بے بی کو بھی نہیں کاٹا.....یسوع مسیح بہوت ٹھیک کرتا.....''

''بے بی کو بھی نہیں کاٹا۔.....ام کو بھی نہیں کاٹا.....اپنا بے بی اچھا.....''

اس نے عقیدت سے آنکھیں بند کرلیں۔سینے پر صلیب بنائی اور انگلیوں کو چوم لیا.....

''یسوع مسیح ٹھیک کرتا.....سب ٹھیک کرتا.....''

پھر ڈاکٹر اور صاحب چلے گئے۔اور وہ بہت دیر تک گردن گھما گھما کر کھڑکی سے مارگریٹ کے کمرے کی طرف دیکھتا رہا۔جہاں کھڑکی پر پڑا سرخ رنگ کا ریشمی پردہ آہستہ آہستہ ہوا میں ہل رہا تھا۔پرسکون انداز میں،گویا گھنٹوں لڑنے کے بعد بوڑھا بیل تھک کر بیٹھ رہا ہو اور دھیرے دھیرے ہانپ رہا ہو۔ابھی بے بی دودھ پی رہی ہوگی.....ابھی بے بی بسکٹ کھا رہی ہوگی.....ابھی اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلی ہوں گی.....اب وہ سو رہی ہوگی۔بے بی آنکھیں بند کئے سو رہی ہے۔گہری نیند کا غلبہ ہو چکا ہے۔اس کے نتھنے آہستہ آہستہ پھڑ پھڑا رہے ہیں.....جیسے کھڑکی کا ریشمی پردہ ہل رہا ہو.....اس کے دل میں آیا کہ وہ ایک بار بے بی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرے۔''بہوت تھک گئی ہو میری بچی.....بہوت جاگی ہونا.....مہینوں سے سو نہیں پائی ہو۔اس لئے اب یہ آرام کی نیند بہوت پیاری لگ رہی ہے۔مجھے بھی بہوت پیاری لگ رہی ہے۔تمہاری یہ نیند بے بی.....بہوت پیاری.....میں تمہاری پیشانی پر ہاتھ پھیروں گا تو کیا تم جاگ پڑوگی؟کیا تم جاگ پڑوگی——؟نہیں جاگوگی نا نہیں جاگنا.....اس کے دل میں قطرہ قطرہ کرکے شبنم گرتی رہی——''میرے پودے کی جڑوں میں یہ کیسی خراش پڑ گئی خداوند.....کیسی خراش.....؟''

بڈھا انکل آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔بائیں پاؤں میں آگ سی سلگ اُٹھی اس نے رانوں پر ہاتھ پھیرا.....پھر وہ تھرتھرانے لگا تو پلنگ پر بیٹھ گیا۔''یسوع مسیح!ام اُدر میں جانا مانگتا.....امارا ہلپ کرو.....اُدر میں بے بی کے ماتھے پر ہاتھ پھیرنا مانگتا.....بے بی

سوتا.....اس کو کس کرنا مانگتا....."

مگر بڈھا انکل کا زخمی پاؤں بدستور دُکھتا رہا۔ اور تھرتھراتا رہا۔

لیکن سہ پہر ہوئی اور کلکتہ والے رابسن صاحب نے اپنی آنٹی کے ہمراہ دہلیز میں قدم رکھا تو وہ غیر اختیاری طور پر اٹھ کھڑا ہوا اور دیواروں کا سہارا لیتا ہوا مارگریٹ کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جہاں مہمانوں کے ساتھ صاحب اور نئی میم صاحب بھی موجود تھے۔

"بے بی بیمار ہے۔ تین ہفتے سے اسے بخار تھا۔ کل ہی تو بخار چھوٹا ہے۔" صاحب نے مہمانوں سے کہا۔

عین اسی وقت صاحب کی نظر پلنگ کے نیچے گئی۔ جہاں خون سے لت پت ایک تولیہ پڑا ہوا تھا اور جسے رابسن صاحب کی آنٹی بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ تولیہ.....؟" آخرش آنٹی نے تولئے کی طرف اشارہ کیا۔

"کون سا تولیہ.....؟" ارے یہ تولیہ کہاں سے آیا اِدر.....؟" صاحب گھبرا کر نئی میم صاحب سے مخاطب ہوا۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ خود بے بی جو دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی زرد پڑ گئی۔

عین اسی وقت بڈھا انکل نے گردن جھکا کر تولیہ کی طرف دیکھا۔ اور لپک کر گرتے گرتے تولیہ کو جھپٹ لیا—— "یہ امارا ہوتا صائب..... یہ امارا ہوتا۔" اس نے اپنی زخمی ٹانگ کے پائینچے کو اوپر کھینچ کر پنڈلی والے زخم کو سامنے کر دیا۔ سفید پٹی چلنے کے باعث خون سے بھر گئی تھی۔

میم صاحب نے بڈھے انکل کو زور سے ایک لات ماری۔ "سور تم اپنا گندہ کپڑا اِدر میں کائے پھینکتا۔"

ضرب کی تاب نہ لا کر وہ اوندھے منہ فرش پر گر گیا.....اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے ابھرنے ڈوبنے لگے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ انگلیوں کو فرش پر ٹیک کر کھڑا ہوگیا۔

"بولو تم گندہ کپڑا کاہے کو اِدر لایا.....؟" صاحب نے بھی بناوٹی غصہ سے کہا۔

بڈھا انکل نے پلٹ کر صاحب کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عجیب

سی بے چارگی جیسے اس نے اگر جواب نہیں دیا تو صاحب پھر اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دے گا
اور گڑگڑا کر کہے گا۔ ''بولو انکل..... بولو..... اپنا بے بی کے لائف کے واسطے بولو.....''

''ام نہیں لایا صاحب.....'' اس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ''ام نہیں، اپنا ٹائیگر
لایا..... اپنا کتا امارا روم سے لایا.....''

پھر بڈھا انکل گھسٹتا ہوا تولیہ لئے کمرے سے نکل گیا۔..... کھڑکی سے گزرتے
ہوئے اس نے نئی میم صاحب کی آواز سنی جو صاحب سے کہہ رہی تھی..... صاحب کو کتنی بار
کہا۔ اس حرام کا کھانے والا کتا کو نکال دو۔ مگر پتہ نہیں صاحب کیوں اسے نہیں نکالتا.....
بے بی تو اس سے بے حد نفرت کرتی..... بے حد نفرت.....''

پھر وہ قریب والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڈھا انکل نے دیکھا کہ سبھوں کے چہروں پر
اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اور بے بی کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ چمک اٹھی ہے۔ جیسے گھنگھور گھٹا
برسے بغیر چھٹ گئی ہو اور زرد ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیل گئی ہو۔

پھر چپکے سے وہ دن بھی آیا جب چھوٹے سے گارڈن کی کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ آس
پاس کے سارے ماحول سے زندگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور بے بی بڑے سے سفید گون میں ملبوس
گلاب اور بیلے کی کلیوں سے لدی پرانے چرچ میں رابسن صاحب کے بازو میں بازو دیے
عقیدت سے آنکھیں بند کئے دوزانوں ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔

مرے خداوند

مرے خداوند

مجھے نئی زندگی دے

مجھے نئی اور خوش گوار زندگی دے

(انجیل مقدس)

پھر بڈھے انکل نے علاقے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹافیاں تقسیم کیں۔ اور بنگلے
کے وسیع دالان میں بچوں کے ساتھ مل کر رقص کرتا رہا۔ اور زور زور سے گاتا رہا۔ وہی اکیلا گیت
جو اس نے بے بی کے بچپن میں یاد کیا تھا۔

ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار

ہاؤ آئی ونڈر وہاٹ یو آر

ٹونکل ٹونکل لِٹل اسٹار

بہت دیر تک وہ خوشیاں مناتا رہا۔لیکن جب دھیرے دھیرے سب بچے بھاگ گئے اور وسیع دالان میں وہ تنہا رہ گیا تو ایکا یکی روشندان سے ایک کبوتر پھڑ پھڑاتا ہوا اُڑا اور چاروں طرف دالان میں چکر کاٹتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ بڈھا انکل نے اچانک ایسا محسوس کیا کہ اس وسیع دالان میں وہ ایک دم سے تنہا ہے اور تنہائی نے دور دور تک ہونٹوں پر انگلی رکھے چپ سادھ لی ہو۔ یوں گویا اب کبھی نہ بولے گی۔ یہ مہر سکوت کبھی نہ ٹوٹے گی وہ اداس ہو گیا۔ بڑبڑا کر باہر نکل آیا۔ جہاں صاحب کھڑا جیپ سے سامان اتروا رہا تھا۔

''ہیپی مارننگ صائب.....!'' زندگی میں پہلی بار اس نے اپنا ہاتھ بڑھادیا شیک ہینڈ.....۔

''اوہ! بڈھا.....شیور شیور.....ہیپی مارننگ.....'' صاحب نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

پھر بڈھا انکل الگ ہو کر کھڑا ہو گیا.....''صائب ام فیفٹی روپیہ مانگتا۔''

''فیفٹی روپیز.....؟ اتنا روپیہ کیا کرے گا بڈھا انکل.....؟''

''ابی نہیں بولے گا صائب— مگر ام کو دو ضرور صائب.....پھر کبھی نہیں مانگے گا دینے سکتا صائب.....؟''

''ضرور دینے سکتا۔''

پھر بڈھا انکل نے روپیہ لے کر صاحب کو گڈ مارننگ کیا۔اور بازار سے ایک سونے کا خوبصورت ہار لا کر بے بی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جہاں ایک طرف تالیاں بجا بجا کر چند جوان لڑکیاں جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔ایک طرف مارگریٹ مہمانوں کے درمیان بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ بڈھا انکل کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔اس کے دل میں دور تک پھول ہی پھول کھلتے چلے گئے اس کے دل میں آیا کہ وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ تالیاں بجائے اور جھوم جھوم کر ناچے..... لڑکیاں ناچتے ناچتے رک گئیں۔سب کی سب بڈھا انکل کو ٹھٹھک کر دیکھنے لگیں۔

''کیا مانگتا بڈھا.....اِدر کیا مانگتا.....؟''

وہ چونک پڑا.....''کچھ نہیں مانگتا.....کچھ نہیں.....اپنا بے بی کو بائی بائی کرنا

مانگتا.........اور.........'' اس نے جیب سے ہار نکال کر آگے بڑھا دیا ——— اِدر بے بی کو اپنے ہاتھ سے نکلس دینا مانگتا.....'' وہ مارگریٹ کے گلے میں ہار پہنانے کی غرض سے بڑھا۔ مارگریٹ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

کیا کرتا بڈھا.........اُدر میں رہو.........اُدر میں رہو.........''

وہ رک گیا۔ ''بے بی اپنا نکلس نہیں مانگتا.........؟''

''نہیں مانگتا.........!'' اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ نفرت سے اس کا منہ بگڑ گیا۔

بڈھا انکل ٹھٹھک گیا۔ چلتے چلتے اس کا دل اچانک رک گیا......... ''نہیں بے بی ایسا ماپھک مت بولو.........ایسا ماپھک مت بولو.........اس کی آواز رندھ گئی......... بے بی ام تم سے کبھی کچھ نہیں بولا۔ امارا رکوسٹ مانو..... نکلس لے لو بے بی.....ام تمارا......... بڈھا انکل ....تمہارا اپنا سرونٹ رکوسٹ کرتا ہے بے بی.........'' وہ مارگریٹ کے قدموں پر جھک گیا۔ ''مارگریٹ''

ایک لحہ میں پتہ نہیں کہاں سے ایک سایہ سا مارگریٹ کے دل میں آیا اور سارے وجود کو نرم کرتا ہوا گزر گیا ——— وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ پھر آہستہ سے گردن جھکا لی......... ''اچھا بڈھا! ام تمارا نکلس قبول کرتا.........'' پلٹ کر قریب کھڑی ہوئی آیا سے مخاطب ہوئی۔ آیا بڈھے سے نکلس لے لو اور ڈی ٹول میں دھو کر امارا صندوق میں رکھ دو.........''

بڈھا انکل یہ سن کر چونک اُٹھا۔ پھر اُس نے ضبط کیا۔ اُس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ اُبھری۔ اس نے آہستہ سے ہار آیا کے ہاتھ میں رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا......... ''بے بی بہوت نفرت کرتا.........اپنا بے بی.........بہوت نفرت کرتا.........بائی گاڈ.........!''

دوسری صبح دوپہر کو ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر بے بی رابسن صاحب کے ساتھ کلکتہ چلی گئی۔ بڈھا انکل سڑک کے کنارے ببول کے بے برگ وبار درخت تلے کھڑا نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی کار کو گھورتا رہا۔ جب کار چلی گئی اور سڑک کی سرخ بجری ساری فضا پر چھا گئی تو اس نے ایکا ایکی محسوس کیا جیسے پاس سے کوئی کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا نکل گیا ہو اور وہ اس وسیع دنیا میں بے کار وتنہا رہ گیا۔ آس پاس علاقے کے چاروں طرف خاموشی مسلط تھی۔ یوں گویا ہوا بھی ساکت ہوگئی تھی۔

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا اور داغ دار فلیٹ کو پلنگ پر پھینک کر بیٹھنا چاہا تو وہ کبوتر اس کے کان کے پاس سے پھڑ پھڑاتا ہوا اُڑ گیا۔ اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا کہیں کچھ نہیں تھا۔ دوپہر بیت رہی تھی باہر سخت دھوپ تھی اور چاروں سمت گہری خاموشی مسلط تھی۔ درختوں کی پتیاں تک خاموش تھیں۔ سارا علاقہ ایک بڑے سے سُنسان قبرستان کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بڈھا انکل اس تنہائی سے گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور علاقہ کی پیچ در پیچ گلیوں میں گھنٹوں پھرتا رہا۔ کہیں کوئی شور نہیں۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ بجز ایک عجیب سی پھڑ پھڑاہٹ کے جو خاموشی کو اور بھی گہری پراسرار اور حزیں تر کر رہی تھی۔ کیا کچھ کھو گیا؟ کیا گھٹ گیا اور بھری پری دنیا سے کہ اچانک سارا عالم کنگال سا ہو کر رہ گیا ہے؟ جب اسے پھرتے پھراتے شام ہونے لگی۔ آفتاب ڈوب گیا۔ اس کی ہڈی ہڈی میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ تو وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اور چہرے پر ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا..... ''اپنا سب کچھ چھین گیا یسوع مسیح..... .....اپنا سب کچھ لُٹ گیا.....!''

پھر جب رات ہو گئی۔ اور آیا نے حسب دستور دو جلی ہوئی روٹیوں پر آلو کے قتلے رکھ کر چینی کی زرد اور پرانی پلیٹ میں لا کر میز پر پٹک دیا تو پہلی بار یہ موٹی خشک روٹی اس کے گلے میں پھنس گئی..... اس نے پورا گلاس پانی غٹ غٹ چڑھا لیا اور روٹیوں کو ہتھیلی پر مسل کر مرغیوں کے ڈربے میں ڈال آیا۔

سامنے بے بی کی کھڑکی بند تھی۔ رات سیاہ سے سیاہ تر ہو رہی تھی۔ اور وہ لحہ بہ لحہ اداس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور آنکھیں بند کر کے بستر پر پھیل کر سو رہا۔ مگر نیند کہاں.....! پتہ نہیں وقت کے کس انجانے موڑ پر رہ گئی ہے۔ پتہ نہیں اسے کس کا انتظار ہے۔ باہر تاریکی گہری ہوتی جا رہی ہے۔ ہوا سائیں سائیں گزر رہی ہے اور دل نہ معلوم کیوں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا۔

بڈھا انکل ایکا ایکی اُٹھ بیٹھا۔ صندوق کھول کر کپڑوں کے نیچے سے وہ پوٹلی نکالی، اسے کھول کر روشنی میں دیکھا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے چوم لیا..... ''بے بی اِدر میں اپنا کوئی نہیں ہوتا..... اِدر میں کیسا ماپھک رہے گا.....؟ بولو..... بولو.....؟؟''

اس نے اپنے پیروں میں فل بوٹ پہنا — پوٹلی کو باندھ کر بغل میں دابا — اور گھستا ہوا

باہر نکل گیا۔

''دنیا کتنا بیڈ مالُم پڑتا ہے اب.....'' اوپر آسمان تاریک تھا۔ گہرے سیاہ جھومتے ہوئے بادل اُمڈ رہے تھے اور منوّر چاند بادلوں کے آگے بھاگتا ہوا نکلا جا رہا تھا۔ کبھی مدھم سا، کبھی روشن، مگر دوڑتا ہوا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا..... ''اپنا مون کِدر کو جاتا .....ایسا ماپھک کدر کو دوڑتا.....؟''

پھر وہ خاموش گردن جھکائے، لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ لوکیلٹی کی خاموش گلی میں ایک لیمپ پوسٹ کے قریب آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے کانوں میں کسی اُڑتے ہوئے کبوتر کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ تھی۔

''تم کدر میں چلا گیا بے بی..... اَم تم کو کدر میں ڈھونے جائے گا..... کدر میں؟ یسوع مسیح اَم کدر میں جائے گا، بولو..... بولو.....؟''

اس نے چلتے چلتے آنکھیں میچ لیں۔ آنسوؤں کے دو قطرے رخسار پر آ پڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے انگلیوں سے سینے پر صلیب بنائی۔ کدر میں جائے گا۔ یسوع مسیح، بولو..... .....بولو.....؟''

پہیّہ

تیرہ برس کی عمر میں شادی شدہ لچھو نے جب دیکھا کہ اس کا شوہر ہر رات اس کی بجائے دُلاری سے پاؤں دبواتا ہے، اور آدھی رات کو اس کو نیچے فرش پر دھکیل کر لیمپ بجھا دیتا ہے۔ اندھیرے میں صبح تک دلاری اس کے پاؤں دابتی رہتی ہے، تو ایک دن وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے اور پھر لوٹ کر خاوند کا منہ نہیں دیکھی۔

''پھر کیا ہوتا ہے لچھو؟''

''لچھو نہیں، لچھو رانی کہو، لچھو رانی.....'' اس نے قطع کلام کرتے ہوئے پہلے اپنے نام کی طرف متوجہ کیا۔

''اچھا لچھو رانی پھر تم نے کیا بتایا تھا؟''

پھر لچھو رانی کو اُلفت یکہ وان مل گیا تھا۔ جس نے پسنجر کے ایک خالی ڈبے میں ایک گٹھری کے ساتھ اسے بھی گٹھری بنا نیند میں بے خبر پایا تھا اس نے لچھو رانی کو جگایا۔ اور پوچھا کہ کہاں جاؤ گی تو لچھو نے نیند اور سفر کی تھکان سے ٹوٹتے ہوئے جسم کو سیدھا کرتے ہوئے غنودگی کے عالم میں کہا۔ ''گھر''۔

پھر الفت یکہ وان نے مزید کچھ سوال اس لئے نہ کرنا مناسب سمجھا کہ اس کیفیت میں اسے معقول جواب کی قطعی توقع نہ تھی۔ اور یکہ میں بیٹھا کر اپنی جھونپڑی میں ایک بھاری گٹھری کی طرح ٹوٹی جھلنگ چارپائی پر پٹک دیا تو وہ چونکی۔

''ارے مجھے کہاں لے آئے ہو۔؟''

''گھر''۔ الفت نے اسی سادگی سے کہا اور چولھے کے پاس پہنچ کر آگ جلانے لگا۔

اس کے بعد لچھو نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ لچھو کو ایک گھر چاہئے۔ اور اس کی مختصر سی زندگی میں ـــــ اس کے خاندان کے پچھلے صدیوں کا روایتی تصور بھی یہی تھا۔ ایک چہار دیواری ہو، جہاں کوئی ٹوٹی جھیلنگ چارپائی ہو نہ ہو۔ ایک چولھا ضرور ہو اور اس کے بعد اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو بس اس کے اندر گھر والا بھی بغیر گھر والا کے گھر کا تصور نامکمل ہوتا ہے۔

الفت کی بیوی سال بھر ہوئے اللہ کو پیاری ہوئی تھی۔ الفت کے گھر میں بن گھرنی کے بھوت کا ڈیرہ لگ رہا تھا۔ ایسے میں نزول رحمت سے فیضیاب نہ ہونا کفران نعمت تھا۔

لچھو رانی اکثر مجھ سے ازدواجی زندگی سے متعلق ایک بہت پرانی گھسی پٹی، مگر حقیقت سے قریب تمثیل پیش کرتی ہے۔ یعنی، یعنی زندگی ایک گاڑی ہے اور عورت و مرد اس کے دو پہیے ..... لہٰذا دونوں پہیوں کا برابر اور متوازی ہونا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ قدم قدم پر دھکے ہیں، ٹھوکریں ہیں!

چنانچہ چند ہی مہینوں کے بعد لچھو رانی کو یقین ہو گیا کہ یہ جو زندگی کی گاڑی وقت کی سڑک پر اچھلتی کودتی، الجھتی پھاندتی بھاگی جا رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سڑک ہی خراب ہے۔ بلکہ پہیے کچھ درست نہیں چھوٹے بڑے ہیں اور آپس میں لاگ نہیں کھاتے۔

بقول لچھو رانی کے چند ہی مہینے کے بعد ہر روز وہ اس کی پٹائی کرتا وہ پٹائی کرتا کہ محاورتاً نہیں، سچ مچ اسے اپنی نانی یاد آنے لگتی۔ منہ اندھیرے وہ یکہ لے کر گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب واپس آتا تو شراب کے نشے میں دُھت پہلے کھانے کو گوشت روٹی مانگتا۔ جب گوشت کھا چکتا اور روٹی پھینک چکتا تو لچھو رانی کی طرف یوں متوجہ ہوتا گویا دن بھر کا قرضہ اتارنے کا وقت آ گیا ہو۔ پھر جب تھک جاتا تو جھیلنگ چارپائی پر یوں پڑ جاتا گویا سارے فرائض پورے ہو گئے ہوں۔ اِدھر اطمینان سے اس اُمید میں پٹنے والی لچھو رانی کہ بعد ازاں عام شوہروں کی طرح محبت بھی کریں گے۔ دیکھتے دیکھتے جب دیکھا کہ کنواں کا پانی ایک دم سے تارا ہو گیا ہے تو سوچتے سوچتے ایک دن وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں رہا۔

اُبڑ کھابڑ سڑک پر چلتے چلتے الفت میاں کے یکّے کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا ہے اور اب تو خدشہ ہے کہ کسی دن سواریوں کو لئے دیئے دھڑام سے کسی کھڈ میں نہ جا گرے۔

لچھو رانی نے بتایا کہ گدّی جی، بس اسی دن سے میں نے یہ جانا کہ یہ چارپائی پر گہری

نیند سویا ہوا الفت یکہ وان جس کے ساتھ میں نے اپنی قسمت جوڑی تھی وہ نرا گوشت کا لوتھڑا ہے۔ گوشت کا لوتھڑا.....!

''پھر تم نے کیا کیا لچھو رانی؟''

''پھر میں کیا کرتی، تھوک دیا اس کے منھ پر اور چلی آئی اس شہر میں.....!''

جس شہر میں الفت میاں یکہ ہانکتا تھا۔ وہیں اس کا ایک یار رہتا تھا سدّو۔ سدّو اکثر الفت کے ساتھ اس کے گھر آیا کرتا۔ خصوصاً رات کے وقت جب الفت شراب کے نشے میں چور ہوتا وہ یکہ سے اتار کر سہارا دیتے ہوئے اسے چارپائی پر لٹاتا، گھوڑی کو کھولتا، یکے کو چھجے تلے رکھتا۔ گھوڑی کے سانی لگا دیتا۔ پھر گھنٹہ دو گھنٹہ گھوڑی کو اتنی محبت سے مالش کرتا گویا گھوڑی الفت کی نہیں خود اس کی اپنی ہے۔

مالکانہ احساس کا یہ ارتقاء تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے خود لچھو رانی کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا۔ جس طرح وہ گھوڑی کو سانی لگاتا۔ گاڑی کو چھجے میں رکھتا، چاہتا کہ لچھو رانی کی بھی دیکھ ریکھ شروع کر دے۔

بلکہ ایک دن جب لچھو سہ پہر کے وقت چھوٹے سے دھندلے آئینے کی مدد سے ماتھے پر بندیا لگا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بندیا ٹھیک جگہ پر نہیں لگ رہی ہے۔

لچھو رانی نے کہا۔ ''تو منھ کیا دیکھتا ہے، لے لگا دے!''

سدّو آگے بڑھ کر بندیا لگانے لگا اور دفعتاً اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور لچھو رانی نے محسوس کیا کہ بندیا سدّو نے گالوں والے پیشانی پر ہی نہیں سارے رخسار پر لگاتے ہیں۔

''یہ کیا کر رہا ہے سدّو؟''

''کچھ نہیں رانی بندیا.....'' سدّو کی آواز حلق میں ٹوٹنے لگی اور وہ سرمستی کے عالم میں اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

لچھو بولی ——— ''میں نے محسوس کیا جیسے کوئی گھمن سانپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لئے تو میں ڈری، پھر پل بھر میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے سدّو کو ایسا دھکا دیا کہ چکرا کر وہ زمین پر جا گرا۔ تب میں پھر لپکی اور چاندی کے کڑے والے ہاتھ سے جو پیٹا، جو پیٹا کہ اس کے حواس ٹھکانے آ گئے۔

لچھو رانی نے کہا کہ گدی جی، یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ میں اگر چہ اسے پیٹ رہی تھی اور وہ پٹ رہا تھا۔ مگر مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ اکیلا گھر ہے اور سدو پھر بھی مرد ذات ہے۔ مگر جب دیکھا کہ اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور گھگھیا کر مجھ سے معافی مانگنے لگا تو میرے ہاتھ رک گئے۔ اب کوئی ایسوں کو کیا مارے۔ اس وقت مجھے بڑی شدید نفرت ہوئی اور میں نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا۔

پھر یوں ہوا کہ لچھو رانی نے جس سدو کے منہ پر تھوکا تھا۔ اس وقت جب اس کو الفت میاں کے کنگلے پن کا احساس ہوا اور ساری دنیا تیرو تار دکھائی دینے لگی۔ تو روشنی کا مینار بن کر جو چیز اس کے سامنے آئی وہ سدو ہی تھا۔

وہ اس رات کے پچھلے پہر جب چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا بلا کھٹکے گھوڑی کے چھجے کے پاس آئی۔ جہاں لید کے پاس ایک میلے ٹاٹ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سدو کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے جگایا۔ سدو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس کے پاؤں پکڑ کر گھگھیانے لگا۔

''نہیں نہیں لچھو، اب نہیں، اب تو مجھے معاف کر دے۔ بہت دن ہو گئے اب تو بخش دے۔''

لچھو رانی کو یوں لگا کہ پھر اس کے منہ پر تھوک دے۔ مگر اندھیرے کنوئیں میں یہی ایک رسی تھی جسے تھام کر وہ باہر آ سکتی تھی۔ تو گدی جی، چار برس میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ میرا خاوند نہ رہ سکا۔ اس سے مجھے بچہ بھی ہوا یعنی میری زندگی کے پیڑ میں پھل بھی لگا مگر میں نے برابر یہی سمجھا کیا کہ سدو میرا مرد نہیں میری جورو ہے۔ میری بیوی اور میں اس کا مرد ہوں۔ جو دن بھر پان کی دوکان میں کتھے چونے کا تماشا لگا کر پیسہ بناتی ہوں۔ بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ اپنے اور سدو کے لئے کپڑے خرید کر لاتی ہوں اور وہ بے چارا دن بھر شریف عورتوں کی طرح کھانا بناتا ہے۔ کپڑے صاف کرتا ہے۔ مسالہ پیستا ہے اور کسی کسی دن جب میرا بدن بہت ٹوٹتا ہے۔ تو وہ مالش بھی کرتا ہے۔

یہاں پہنچ کر لچھو رانی شرما جاتی اور آنچل سے منہ ڈھک کر ہنسنے لگتی۔

میں کہتا ''ساری کہانی میں لچھو رانی یوں تو تم ہر جگہ اپنے عورت پنے کا پتہ چھوڑتی آئی

ہو۔ مگر ظاہری طور پر یہیں عورت دکھائی دیتی ہو۔ اپنے دیس کی عورت.....''

''کیا اپنے دیس میں عورتیں میرے جیسی نہیں ہوتی ہیں کیا۔ کیا اس کی دو ٹانگیں، دو ہاتھ، ناک، آنکھیں.....نہیں ہوتیں.....؟''

''ہوتی تو ہیں!'' مگر کوئی عورت تمہاری طرح اپنے شوہر کا شوہر نہیں ہوتی اور اپنے شوہر سے بدن نہیں دبواتی۔

''تو میں کیا کروں۔ وہ نکھٹو ہے بھی ویسا ہی۔۔۔''

پھر میں اچانک ایک الگ سوال کر بیٹھتا ہوں۔ ''جو بھی سہی پر تم اس کے ساتھ خوش تو ہو؟''

لچھو رانی اس سوال کو سن کر کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر لمبی سانس لے کر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے۔ ''پتہ نہیں جی، پر ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ اور چاہیے۔''

بس یہی وہ مقام ہے جہاں میرا قلم رک جاتا ہے اور اپنے آپ میں یوں الجھ جاتا ہوں جیسے گھنے جنگل میں کھو گیا ہوں۔ لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی بڑے مزے میں چلی جا رہی ہے۔ سڑک بھی ہموار ہے۔ اور دونوں پہیے بھی چھوٹے بڑے نہیں۔ صرف اتنی سی چوک رہ گئی ہے غالباً کہ دائیں طرف بایاں پہیہ لگ گیا ہے اور بائیں طرف داہنا.....مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بظاہر اس جگہ پہنچ کر کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ یعنی راجہ اور رانی مزے سے رہنے لگے ہیں۔ قصہ ختم اور پیسہ ہضم.....

اگر چہ یہاں تک سوچنے کے بعد میں بظاہر افسانے کو اختتام تک پہنچا دیتا ہوں مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخیل طرازی میں مجھ سے کہیں بھول ضرور ہوئی ہے۔ کچھ چھوٹ رہا ہے۔ کوئی کمی پڑ رہی ہے۔ گویا اس گہری زندگی میں کہیں کوئی موڑ آنا چاہیے۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ.....کوئی.....

چنانچہ میں لچھو رانی پان والی کی کہانی نہیں لکھ پاتا۔ میرے قلم کو، میری روح کو، لچھو رانی کی زندگی سے متعلق کسی انوکھے حادثے کا انتظار ہے۔ یہ حادثہ کب وقوع پذیر ہوگا، کن حالات میں ہوگا۔ پھر اس سے لچھو کی یکسانیت سے بہنے والی زندگی پر اور بعد ازاں میرے افسانے پر کیا ردِ عمل ہوگا کیا ہوگا.....کیسے ہوگا.....

میں چند ہفتوں کے لئے آفس کے کام سے باہر چلا گیا۔ کام کی کثرت اور نئے لوگوں کے جھمیلے میں لچھو رانی اور اس کا افسانۂ زندگی تو کیا میں اپنے آپ کو بھول سا گیا۔ چند ہفتے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو رات مجھے ملیریا بخار نے آدبوچا۔ اکیلے گھر میں بخار اور درد کی شدت کے باعث ساری رات اور سارا دن میں نے خود فراموشی کے عالم میں گزار دیا۔ شام ہوتے ہوئے بخار ذرا کم ہوا تو سرہانے لچھو رانی کو پنکھا جھلتے ہوئے پایا۔

''میں نے صبح سویرے تالا کھلا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا کہ تم آ گئے ہو..... ذرا دن چڑھ لے تو تم خود آؤ گے سگریٹ لینے۔ پاٹ دیکھتے دیکھتے دوپہر ہونے کو آئی بند دروازہ کھلا ہی نہیں تو میرے من میں شک ہوا۔ دیکھا تو سچ مچ تم مردہ سے پڑے ہو۔''

میں نے اُٹھنا چاہا تو اُس نے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں، اُٹھو نہیں، ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔''

''ڈاکٹر کیسے آیا؟'' میں نے گردن گھما کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی ——— ''کیا تم لائیں؟''

''نہیں جی، ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے کہا، اندر چل کر دیکھ لو۔'' لچھو رانی نے یوں کہا گویا اپنے آپ کو پس پردہ رکھنا چاہتی ہو۔

دس دنوں تک لچھو رانی نے میری بڑی خدمت کی۔ سارا سارا دن پنکھا جھلتی، ٹھنڈے پانی کی پٹی چڑھاتی، دودھ اور ساگودانہ بنا کر دیتی اور ان سب سے بڑا کام یہ کرتی کہ تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو دور دور تک بھٹکنے نہ دیتی۔ بلکہ راتوں کو جب کبھی میری نیند ٹوٹتی تو محسوس ہوتا گویا لچھو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے یا باہر دروازے پر بیٹھی اونگھ رہی ہے۔

''یہ تم کیا کرتی ہو لچھو؟ تمہاری دکان اور خراب ہوتی ہوگی اور سدّو کی کمر کام سے دوہری ہو جاتی ہوگی!''

''سدّو کو میں نے مار بھگایا۔'' لچھو رانی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

''آئیں ———'' میں نے محسوس کیا جیسے لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی دھڑام سے کھڈ میں گر پڑی ہو، میں نے پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور مطمئن تھا۔

''یہ کیسے ہوا؟''

''ہوا ——— تم اچھے ہو جاؤ تو بتاؤں گی۔''

لچھو رانی کے لہجے کی طمانیت سے میں بھی مطمئن ہو گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پاؤں نہیں دبائے ہوں گے بے چارے نے۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔ اس موگے کی قسمت ہی میں پاؤں دابنے لکھے تھے۔ مرد نام کی تو اس میں چیز ہی نہ تھی۔ میری دکان میں پان کھانے وہ پٹھان آتا تھا نا، بڑی بڑی مونچھوں والا۔''

لچھو رانی کی دکان میں بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان پان کھانے کے علاوہ کچھ اور امید میں بھی آتا تھا۔ لچھو رانی محسوس بھی کرتی تھی۔ مگر اتنا بھی نہیں سوچتی ——— جوان آدمی ہے۔ دل لگی کر لیتا ہے۔

مگر ایک روز شام کے جھٹپٹے میں جب دکان میں اور کوئی گاہک نہ تھا اور لچھو رانی گوبر مٹی سے سامنے والا فرش پوت رہی تھی۔ پٹھان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا باتوں بات میں نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اس کی لچھو کو توقع نہ تھی۔ اُس نے سنبھالا لیا اور زور سے ایک جھٹکا مار کر پٹھان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ اُس نے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اُٹھالی اور ڈپٹ کر بولی۔

''خبردار ——— جو آگے بڑھے۔''

مگر وہ پٹھان تاؤ میں تھا۔ اس نے لپک کر پھر کلائی پکڑ لی اور لگا جھنجھوڑنے لچھو رانی مدافعت کر رہی تھی۔ مگر سدّ و راہگیروں کی طرح صرف بیچ بچاؤ کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

لچھو رانی نے بتایا گدی جی! تب میں نے گالی دے دی اور للکارا کہ پاس پڑی ہوئی لوہے کی چھڑ سے دے ایک ——— مگر یہ سن کر تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے چھڑ اُٹھایا تو ٹھیک، مگر اسی وقت پٹھان نے اسے ایک لات رسید کی اور وہ دور جا گرا۔

پھر ارے باپ رے باپ کہتا ہوا جھونپڑی میں گھس گیا جیسے لچھو کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو خیر سے راہگیروں نے پٹھان کو مار بھگایا۔ ورنہ پتہ نہیں اس دن کیا قیامت گزرتی……

قیامت تو اس دن گزری جس دن لچھو میرے برتن مانجھ رہی تھی اور میں صحن میں کرسی پر بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔ لچھو نے راکھ بھرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو

اوپر پھینکتے ہوئے کہا۔

''یہ گھر بھی کتنا سونا سونا لگتا ہے۔تم شادی کرلو۔''

''شادی تو میری ہو چکی۔لچھو تم تو جانتی ہو!''

پر بیگم جی یہاں رہتی تو نہیں کیا فائدہ اس شادی کا!''

میں نے کاغذ سے نظر اٹھا کر دیکھا۔وہ گویا میرے حالات سے کافی متاثر تھی۔

''اب دیکھو نا،تم اتنا بیمار پڑے۔کوئی دیکھنے سننے والا نہ تھا۔اگر تم کو کچھ ہو جاتا تو؟''

''کچھ نہیں ہونے کا ہم کہانی لکھنے والے بڑے بے حیا ہوتے ہیں پھر تم جو تھیں،کتنا خیال رکھا ہے میرا تم نے،تم نہ ہوتیں تو شاید میں اب تک مر کھپ گیا ہوتا.....!''

اس نے پلٹ کر کہا۔''خدا نہ کرے.....تم جگ جگ جیو جی.....!''

اس کے پلٹ کر دیکھنے میں،اس کے لہجے میں،الفاظ میں کوئی رمز تھا۔کوئی راز تھا۔یہ عام انسانی جذبے سے کچھ اوپر کی چیز تھا۔مگر میں سمجھ نہ سکا۔ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھو کے گزر گیا۔جھنجھوڑ نہ سکا۔

تیسرے دن وہ میرے یہاں آئی اور میری کتابیں سجاتے ہوئے بولی۔'جانتے ہو جی لوگ کیا باتیں بناتے ہیں.....کہتے ہیں.....کہتے ہیں.....وہ رک گئی۔

''کیا کہتے ہیں لوگ؟''میں کہانی کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

''کچھ نہیں جی،تم نہیں سمجھو گے۔''

''اچھا''،میں نے بے خیالی میں کہا اور افسانوں کی دنیا میں کھو گیا۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب چراغ جل چکے تھے اور رم جھم بارش کے باعث فضا خوشگوار ہو رہی تھی۔لچھو رانی ایک نہایت خوبصورت ساڑی میں ملبوس چہرے پر پاؤڈر لگائے، مخموری چال چل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کیا بات ہے،آج بہت خوش دِکھ رہی ہو؟''

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے!''

''کیا فیصلہ کرلیا ہے؟''میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔آج لچھو رانی مجھے کچھ اجنبی اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔

''کچھ نہیں ـــــــــ''اس نے ہڑ بڑا کر اپنے آپ کو سنبھالا۔''میں نے یہ سوچا ہے آج سے میں آپ کے یہاں سویا بھی کروں۔دن بھر تو ایک طرح سے رہتی ہی ہوں۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے لچھو رانی............؟''

''کیوں؟ کاہے نہیں ہوسکتا۔میں تمہارا کھانا بنا سکتی ہوں، جھاڑو دے سکتی ہوں برتن مانجھ سکتی ہوں۔بستر تک لگا سکتی ہوں تو پھر یہ کیسے نہیں ہوسکتا؟''

لچھو کی منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔پھر میں نے پلٹ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے فیصلہ کن انداز دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔

''مگر..........مگر''

''مگر کیا؟ وہ میری بوکھلاہٹ کا تماشہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔''نہیں بھائی میں تو اب یہاں سے ٹلنے والی نہیں۔کل صبح تک سارے ضروری سامان لے آؤں گی۔............

''لیکن، کل تو میں مہینہ بھر کے لئے باہر جا رہا ہوں!''

''کوئی بات نہیں۔''وہ قطع کلام کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔''تب تو یہاں میرا رہنا اور ضروری ہے۔آخر گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا تمہارے پیچھے جانتے ہو آج کل کتنی چوریاں ہورہی ہیں............''

مناسب یہی معلوم ہوا کہ میں فی الحال خاموش رہوں۔میں نے ایک صندوق میں ضروری سامان رکھے اور چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگیا۔

''ارے ابھی سے، جاؤ گے تو کل ہی نا؟''

''نہیں مجھے آج ہی جانا پڑے گا۔''میں نے جیب سے کنجی نکال کر اس کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔''مہینہ بھر بعد آؤں گا۔''

اس کے بعد میں نے اس رات تو ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔دوسرے ہی دن شہر کے دوسرے رخ تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹک گیا۔

بہت دن ہوگئے۔غالباً چھ مہینے گزر گئے۔لچھو رانی تا حال میرے ذہن پر کنکھجورے کی طرح قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ایک روز میں بزاز کی دکانوں کے قریب سے گزر رہا تھا ایک کھلی ہوئی فٹن سے کسی نے مجھے آواز دی۔پلٹ کر دیکھا تو فٹن میں ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہوئی

تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا —— ''میں ہوں گدی جی، لچھو رانی ....''

لچھو رانی! یکا یک میرا دل دھک سے ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میری اپنی زندگی کی گاڑی کھڈ میں گر پڑی۔ لچھو نے نقاب الٹ دی اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

''ڈرو مت جی۔ میں نے شادی کر لی۔''

''شادی کر لی لچھو!'' میں نے کچھ ندامت، کچھ اطمینان و مسرت سے کہا۔

اس کے چہرے پر بڑا گہرا میک اپ تھا۔ سرخی، پاؤڈر، ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اور مسرت سے اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔

''خوش تو ہو لچھو رانی؟''

''بہت —— '' وہ گویا میرے سوال کی منتظر تھی۔'' میرا خاوند مرد ہے۔ بزدل نہیں۔ ڈرپوک نہیں، اتی بڑی چھاتی ہے اس کی، گدی جی، بھگیڑو نہیں!''

مجھے معلوم تھا ان سارے تیروں کا نشانہ میں ہی تھا۔ میں نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا، ہم کہانیاں لکھنے والے بڑے بزدل، بڑے کمزور ہوتے ہیں لچھو، تمہاری گاڑی کا پہیہ تو ....؟''

''کہانا بہت مضبوط ہے............'' اس نے برجستہ کہا اور نقاب چہرے پر الٹ لی۔

''وہ آرہے ہیں۔ تم جاؤ............''

میں گاڑی سے الگ ہٹ گیا۔ ایک بزاز کی دکان سے کپڑے کا پیکٹ لئے ہوئے لمبا تڑنگا سرخ پٹھان جھومتا جھامتا فٹن کی طرف آرہا تھا۔............

○○

منظر و پس منظر

سنیئے ویو میں لوگ آنے جانے لگے ہیں۔

ایک ایک کر کے کافی لوگ پہنچ گئے ہیں۔ خالی میزیں بھر رہی ہیں۔ کئی خوبصورت نسوانی چہرے بھی دکھلائی دینے لگے ہیں۔ رنگین اور قیمتی کپڑوں سے ایوننگ ان پیرس کی خوشگوار لپٹیں آ رہی ہیں۔ خوبصورت مسکراہٹیں بکھر بکھر جاتی ہیں۔ کوئی خوبصورت جوڑا ایک دوسرے کے بازو کا سہارا لئے داخل ہوتا ہے۔ تو مشتاق نگاہیں بڑی محبت سے خوش آمدید کہتی ہیں اور پژمردہ چہروں پر جھومتی ہوئی بہار کی سی دل نواز کیفیت چھا جاتی ہے۔ کاؤنٹر پر اونگھتے ہوئے مینجر کی آنکھوں میں تاجرانہ چمک آ گئی ہے۔ اور وہ سفید وردیوں میں ملبوس بگلوں کی طرح دیکھنے والے بیروں کو بڑی کڑی نظر سے دیکھنے لگتا ہے جو اَب تک پچھلی دیواروں کا سہارا لئے اونگھ رہے ہیں۔ جواب میں یہ بیرے کوک بھری ہوئی گڑیوں کی طرح اِدھر اُدھر گردن جھکائے ہوئے دوڑنے لگے ہیں۔ تھکے ہوئے چہرے پر زبردستی کی بشاشت پیدا کئے ہوئے ـــــ سنیئے ویو میں ایک زندگی سی پھیل رہی ہے۔ لوگ باگ باتوں میں مصروف ہیں محبت کی باتیں، فراق کے غم میں ڈوبی ہوئی جاں گسل باتیں، کہ آنکھوں میں سیلاب سا اُمڈا چلا آئے۔ کوئلے اور ابرک کی کانوں اور نئی ملوں کا ذکر، کلکتہ کے ریس کورس میں جیتی ہوئی ان بے شمار رقموں کے تذکرے جو رات کی رات کسی بنگالی حسینہ کی آغوش اور پرانی شراب میں غرق کر دی گئی ہوں۔

پھر قہقہے، چھیڑ چھاڑ، چمچے اور پلیٹوں کی آوازیں۔ ایک پیارا سا شور، ایک دل کش ہنگامہ اور اس کے درمیان سفید وردیوں میں لپٹے ہوئے سیاہ رو بیروں کی عقیدت سے جھکی ہوئی گردنیں اور رعب حسن اور رعب دولت سے کانپتے ہوئے لب آہستہ سے بڑے سہمے ہوئے انداز

میں، گویا شہنشاہ وقت کو بیدار کرنے والی کنیزوں کے خریدے ہوئے ہونٹ ہل رہے ہوں ——

یس سر..... بہت بہتر صاحب آل رائٹ سر.....

رس گلّے سے بھری ہوئی پلیٹ کو دیکھتے ہوئے مارواڑی نوجوان نے اپنے بالمقابل بیٹھی ہوئی انگلو انڈین محبوبہ کو کہا۔ ''ارے کھاؤ، کھاؤ ڈارلنگ، شرمانا کیسا؟''

یہ حسینہ، جس کی آنکھوں میں تقدس تھا، بڑی چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے آس پاس لوگوں کی نگاہوں میں کچھ تلاش کرتی ہے۔ پھر ایک بار مسکرا کر اپنے محبوب کو دیکھتی ہے۔ رس گلّے کو تکتی ہے اور پھر آہستہ سے کانپتی ہوئی انگلیوں میں تھامتے ہوئے کانٹے میں رس گلّے کو پھنسا کر منہ میں رکھ لیتی ہے اور آہستہ آہستہ منہ چلاتی ہے اس کا چہرہ شرم سے کشمیری سیب کی طرح سرخ ہو گیا۔ طلوع دم سورج کی طرح پاکیزہ۔

نہ شرما حسینۂ صبح بہاراں، نہ شرما..... زہر میں ڈوبے ہوئے یہ افیونی رس گلّے جب رفتہ رفتہ تمہارے ضمیر کو ایک دم سے گہری نیند سلا چکے ہوں گے۔ اس وقت یہ کشمیری سیب سڑ گل کر زرد ہو چکے ہوں گے۔ آنکھوں کا تقدس مر چکا ہوگا۔ اس وقت رس گلا تو کیا سگریٹ کے ایک ٹکڑے کے لئے تم سرمایہ حیات لٹاتی پھرو گی۔ اور لوگ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے۔ کشمیر کے سیب آج ہی سے پک رہے۔ اس لئے اے حسینہ.....

بیرے نے چائے کی ٹرے سامنے لا کر رکھ دی ہے۔

''بیرہ تمہاری عمر کیا ہے؟''

''چالیس برس جناب!''

''کتنے برس سے بیرے کا کام کر رہے ہو؟''

''کوئی چھتیس برس سے جناب!''

''پورے چھتیس برس ہوئے؟''

''یس سر ——''

''ان چھتیس برسوں میں تم نے ''یس سر'' کے علاوہ بھی کچھ سیکھا ہے؟''

''نہیں جناب —— مگر میرا بیٹا شاید وہ سب کچھ سیکھ رہا ہے جو میں نے نہیں سیکھا وہ حرام زادہ ہوٹل کی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ وہ شیشے کے برتن سر پر لئے گلی گلی میں مارا پھرتا ہے۔ اُلو

کا تھا، بالکل سڑی نکلا حضور، بالکل سڑی —— " پھر اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا —
" کبھی کبھار میں ہوٹل کی کوئی اچھی سی چیز چرا کر لے جاتا ہوں تو اسے نہیں کھاتا۔ کہتا ہے اس کے کھانے سے میری آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگے گا۔ ہی ہی ہہ ہہ .... حرام زادہ، جناب ایسا کھانا تو اس نے عمر میں چکھا نہ ہوگا۔ ویل سر؟"

"یس سر —— "

بیرہ چلا گیا۔

اس نے اپنے ناخلف لڑکے کی شکائتیں کر کے میری خوشنودی حاصل کر لی ہے۔ اس نالائق اولاد کی شکائتیں جس نے باپ کا سبق بھول کر زندہ رہنے کے لئے ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ نادان چھوکرے اب تمہیں باپ کی جائداد میں سے ایک سکہ بھی نہیں ملے گا!"

نگاہیں اٹھیں تو دروازے پر کھڑے ہوئے غضنفر نواب دکھائی دیئے ان کے ساتھ خلاف دستور ایک کی جگہ دو لڑکیاں ہیں۔ قیمتی امریکن سوٹ زیب تن ہے۔ وہ اُکتایا ہوا چہرہ لئے ہو — ایک خالی میز کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا حال ہے حضور نواب صاحب؟"

"میں بہت پریشان ہوں .... بہت پریشان ہوں ....!"

اپنے باپ کے انتقال کے بعد جب غضنفر نواب نے ایک روز اپنے سرمائے کا اندازہ لگایا تو ان کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اور وہ کالج کی ورڈس ورتھ کی شاعری شیلے کی نظموں، اور شیکسپیئر کے ادب کو بھاڑ میں جھونک، اپنے بچپن کے شوق کو پورا کرنے بمبئی چلے گئے۔ اور وہاں انہوں نے اپنے دیرینہ شوق کو پورا کیا۔ یعنی ایک فلم بنائی، فلم ناکام رہی۔

—— کوئی بات نہیں نواب صاحب، کوئی بات نہیں۔ یہ ہوتا ہی ہے۔ چار ہی لاکھ کی تو بات ہے ایک کوشش اور سہی —— مرد باید کہ ہراساں نہ شود ....!"

نواب صاحب نے حواریوں کے مشورے سے ایک اور فلم بنانی شروع کی ——
"نواب صاحب دیکھی ہے آپ نے، کیا غضب کی چھوکری ہے۔ کیا جوانی ہے۔ کیا سینہ کا ابھار ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ وہ ادھر باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے کی من و عن تفسیر ہے .... حضور صرف ایک بار شرف باریابی دے کر دیکھا جائے ....!"

"حضور فلم کی ہیروئن نے آج رات آپ ہی کے یہاں ریہرسل کے لئے کہا ہے ....

.....حضور یہ..... حضور وہ.....۔"

اور یوں نواب صاحب کے گیارہ لاکھ روپے ختم ہو گئے۔ اور فلم کی کاغذی تیاری بھی مکمل نہ ہو پائی۔ تو اچانک ایک روز جب نئی اکسٹرا نے پانچ ہیرے والے جڑاؤ ہار کی فرمائش کی تو ان کی نظر بینک بیلینس کی طرف گئی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ عین اسی وقت حواریوں، نئی اکسٹرا گرل اور فلم کی ہیروئن، بہ بیک وقت سبھوں کو اپنی اپنی مصروفیات یاد پڑ گئیں اور نواب صاحب نے دیکھا کہ کمپنی کے بے شمار نوکران کے آگے پیچھے گھومنے لگے ہیں۔ تو انہوں نے چپکے سے ایک رات یہ کہہ کر کہ نئی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولہاپور کی جگہ کا معائنہ کرنے جا رہا ہوں۔ اپنا بستر تک چھوڑ کر بمبئی سے چلے آئے۔ اور میں بہت پریشان ہوں ..... بہت پریشان ہوں.....!"

آپ بہت پریشان ہیں۔ اس اعلیٰ سوٹ، ان دو لڑکیوں کے درمیان؟ سنئے ویو کے رومان آفریں ماحول میں آپ کو سکون نہیں.....؟؟ اور وہ حرام زادہ بیرہ کا چھوکڑا کہتا ہے کہ گلی گلی گھومنے اور سوکھی روٹی میں بہت مزہ ہے۔ بوڑھا بیرہ سچ کہتا ہے۔ کہ لڑکا سڑی ہے۔ سولہ آنہ سڑی معلوم پڑتا ہے..... نواب صاحب ایک خالی میز پر چپ چاپ بیٹھ گئے ہیں۔ انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی وہ بہت پریشان ہیں۔

نواب صاحب کے پہلو والی میز پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسائے بیئر کی ہلکی ہلکی چسکی لے رہی ہے۔ اس کی ساری کا رنگ چاکلیٹی ہے اور بلاؤز سفید۔ جس پر جا بجا شیشے کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ اس کا جسم پلپلا ہو گیا ہے۔ مگر چہرہ پاؤڈر کی دبیز تہہ کے باعث قدرے خوبصورت لگ رہا ہے۔ وہ بوڑھی ہو کر بھی جوان ہے۔ اس نے اپنی خزاں رسیدہ عمر کو مصنوعی بہار سے چھپا لیا ہے۔ عمر کی یہ منزل اسے پسند نہیں۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ عمر کی یہ منزل عشق کے لئے موزوں نہیں۔ اور عشق وہ روحانی غذا ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ نامکمل ہے اور اس رات کی طرح ہے جس رات پونم کی چاندنی نہ ہو۔ اس نے شادی نہیں کی ہے۔ والدین کے لاکھوں روپے بینک میں اس کے نام سے محفوظ ہیں۔ جس کی بدولت وہ آج بھی جوان ہے۔ اور آج بھی وہ بے کار گریجویٹوں کے گرم اور صحت مند جسم خرید سکتی ہے۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور اس پیدائشی حق کی محافظت کے

طریقوں سے وہ اچھی طرح واقف ہے لوگ نادان ہیں جو اسے شادی کی تلقین کرتے ہیں۔ یوں پابندی میں پڑ کر انسان ایک فطری حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھر بکھیڑے الگ..... نا بابا نا بابا..... مجھے یہ زندگی پسند نہیں۔ مجھے تو ہر روز ایک نئی چیز چاہیے۔ جہاں کوئی نئی شکل دکھائی دی، دل ناداں مچلتا ہے۔ کہ بس ہم تو یہی لیں گے.....

نواب صاحب کو اپنے قریب پا کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھی ہیں۔ آہا کتنا خوبصورت جوان ہے۔ کیسا توانا جسم ہے۔ اس کی نگاہیں نواب صاحب کے پریشان مگر خوبصورت چہرے پر ٹکی ہوئی ہیں۔ اور چہرے سے یوں معلوم پڑ رہا ہے۔ جیسے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھ والے نوجوان کو ایک دم بھلا دیا ہے۔ اور اب اس کی ٹانگیں بھی الگ ہو چکی ہیں آہا آہا کتنا خوبصورت جوان ہے۔ کیسا.....

''نواب صاحب پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس دور میں عورت کے جسم ہی کی نہیں، مرد کے جسم کی بھی قیمت لگ سکتی ہے..... اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نواب صاحب! اب وہ ادھوری فلم ضرور مکمل ہو جائے گی..... کیونکہ اب دلِ ناداں مچل رہا ہے کہ ہم تو یہی لیں گے۔

اب سینے ویو میں زندگی کی لہریں بڑھ رہی ہیں۔ گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ کچھ دیر پہلے جو ایک اونگھتی ہوئی بجھی بجھی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ دھیرے دھیرے گاہکوں کے شور میں بدل رہی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اب تک جو زندگی نیند کی آغوش میں پڑی ہوئی تھی۔ اب ہولے ہولے جاگ رہی ہے۔ مگر اس کی آنکھوں کا خمار اور نیند کی مستی باقی ہے۔ کچھ لمحوں کے بعد یہ خمار اور مستی گہرے ہنگامے میں یوں کھو جائیں گے کہ ڈھونڈے سے بھی سارے بار میں نہیں ملیں گے۔ اور اس وقت شرمائی لجائی زندگی بے حیائی کے ساتھ ناچ اُٹھے گی اور خوبصورت عورتیں جنھیں دیکھنے سے ایک طرح کی شگفتگی اور بھرپور زندگی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے عاشق کے ساتھ آرکسٹرا کی دھنوں سے ہم آہنگ ہو کر رقص میں محو ہو جائیں گی۔ یہ مست جسم ایک دوسرے سے مس ہوں گے اور آنکھوں میں سوئی ہوئی ہوس انگڑائی لے کر بیدار ہو اٹھے گی۔

ایک حسین شور پھیلنے لگا ہے۔ قوس قزح سے رنگینی اُمڈی پڑتی ہے۔ خوبصورت چہرے

سینٹ میں بسے ہوئے سرسراتے ہوئے قیمتی کپڑے، بکھرے بکھرے خوشبو دار تیلوں کی ہلکی سی رمق لئے ہوئے بال جو سینے ویو کے الیکٹرک فین کی ہوا سے ریشم کی تاروں کی طرح اُڑنے لگتے ہیں۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس مردانہ جسم، شوخ طرح دار ٹائیاں، قیمتی زیور، خوشبو، کریم، اور پوڈر کی موٹی تہیں ——— بات بات پر بلاوجہ پھوٹ پڑنے والے قہقہے، یہ ہنسی، یہ تبسم، یہ زندگی، یہ پوڈر کی موٹی تہیں ——— یہ نرم و نازک ہاتھ اپنے محبوب کی طرف کیوں بڑھتے ہیں؟ کسی اعلیٰ وارفع جذبے سے سرشار ہو کر کیوں نہیں بڑھتے۔ ان محبت آمیز نظروں میں تصنع کیوں ہے؟ یہ سب ایک برقی قوت کے محتاج کیوں ہیں؟ ان مسکراہٹوں سے ستاروں کی تابناکی اور چاندنی میں جھومتے ہوئے سمندر کی موجوں کا جمال کون چھین لے گیا؟؟ اس ہنسی میں شکست خوردہ زندگی کی اُجڑی ہوئی تمناؤں کا سوگ کیوں ہے؟؟؟

ہال میں سگریٹ کا دھواں پھیل رہا ہے۔ باتوں، قہقہوں، چمچوں اور پلیٹوں کا شور اب سمع خراشی کرنے لگا ہے۔ خوب صورت رنگین کپڑے، قیمتی زیوروں اور بناوٹ کی تجلیاں آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی ہیں۔

میں نے ایک ہلکے سے دھکے سے شیشے کی کھڑکی کھول دی ہے اور باہر دیکھنے لگا ہوں۔ کئی گھنٹوں تک برس چکنے کے بعد بارش اب تھک گئی ہے۔ آس پاس دور دور تک ساری چیزیں دھل کر صاف ہو گئی ہیں مکانوں اور دکانوں کے چھجے، کالی ناگن کی طرح کولتار کی سیاہ فام سڑک، زرد رنگ کی رفیع الشان سینما بلڈنگ، سڑک پر ٹھہری ہوئی رنگ برنگ کی کاریں، سب دُھل کر دلہن کی طرح نکھر گئی ہیں۔

راہگیروں کی آمد و رفت پھر سے شروع ہو گئی ہے۔ ان سب پر ڈوبتے ہوئے آفتاب کی بھیگی من بھاؤنی کومل کرنیں گویا اپنے آنچل سکھا رہی ہیں۔ دھوپ کی اے پیاری کرنوں! تم ہر صبح کہاں سے آتی ہو اور پھر کہاں شام ہوتے ہی چل دیتی ہو؟

کرنیں جواب نہیں دیتیں ——— صرف مسکراتی ہیں۔ ہولے ہولے..... جیسے دولہن ہوں..... شاید سہاگ رات منانے جا رہی ہوں۔

فٹ پاتھ پر بوڑھا رفیو جی جو دیر سے اپنا سامان لئے ایک دکان کے چھجے تلے رکا ہوا تھا۔ بانس کے ٹیڑھے میڑھے اسٹینڈ پر نئے سال کا کلنڈر سجانے لگا ہے۔ وہ لوگوں کی توجہ اپنی

طرف کھینچنے کے لئے زور زور سے ہاتھ ہلا ہلا کر چلانے لگا ہے..... نئے سال کا کلینڈر، ساڑھے چھ آنے میں، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، ساڑھے چھ آنے میں، مہاتما بدھ ساڑھے چھ آنے میں، نرگس، ثریا، تاج محل شاہجہاں ساڑھے چھ آنے میں، نئے سال کا کلینڈر.....''

احمق رفیو جی! ابھی کوئی پولیس کا سنتری آئے گا اور تجھے دھکے دے کر حوالات لے جائے گا۔ مساوات کی دم! تم نے ہر چیز ایک ہی بھاؤ بیچنی شروع کر دی ہے۔

آج کئی گھنٹوں تک بارش ہوتی رہی ہے۔ جس کے باعث رفیو جی کے کلینڈر اتنی تعداد میں ابھی نہیں بک سکے ہیں کہ اس کے کمیشن سے وہ چاول ہی لے جا سکے۔ کل جب اس کے ہرے بھرے گیہوں کے کھیتوں میں زندگی لہریں مار رہی تھی کوئی اسے چاول کھانے کو کہتا تو وہ اسے اپنی خواہش کی توہین سمجھتا۔ اسے گالی سمجھتا۔ مگر آج اُنہیں چاولوں کے صرف چند دانوں کے لئے وہ دن بھر اور رات گئے تک گلا پھاڑتا ہے۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے پوتے جو کل تک صرف دودھ پیا کرتے تھے۔ ایک ضعیف بیوی اور اپنا ایک جہنم چاول کے ان ہی دانوں کے منتظر تھے۔ آج بھی شاید نصف پیٹ کھانے پر ہی اکتفا کی جائے گی۔ کیونکہ آج بھی کمیشن میں اتنے پیسے نہ مل سکیں گے کہ جو جہنموں کے لئے ایندھن ہی اکٹھا کر سکیں مگر پچپن برس کا بوڑھا دل مایوس نہیں۔ وہ آج بھی خوش ہے۔ اس کی نگاہیں مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ وہ حالات سے مایوس نہیں ۔کل جب وہ فسادات سے تباہ ہو کر ایک قافلہ کے ساتھ چل پڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا جوان لڑکا تھا دو پوتے اور ایک بوڑھی اور ہزار تباہ حال انسان تھے۔ بوڑھے، بچے، جوان، عورتیں، مرد اور کچلی لٹی ہوئی خوبصورت لڑکیاں.....زخم.....آنسو خون.....پیپ.....مگر ان ساری چیزوں سے بڑھ کر ایک اور شئے تھی۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں ایک کلی مہک رہی تھی۔ جیسے گھنے اندھیرے میں نور کی ایک لکیر تھرتھرا رہی ہو۔ راستے میں بڑی بڑی جنتیں آئیں۔ مگر یہ کلی بدستور مہکتی رہی۔ گرمی، دھوپ، بارش اور مسلسل تھکان اور اذیت نام بھوک نے اس کے قدموں کی طاقت بھی چھین لی تھی۔ مگر وہ کلی مہکتی رہی۔ ایک دن اچانک قافلے پر حملہ ہوا۔ اس نے جواں ہمتی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے جگر کے ٹکڑے جوان بیٹے کی گردن کو تن سے الگ ہوتے دیکھا۔ پھر بھی وہ کلی بدستور مہکتی رہی۔ پھر وہ ایک تاریک پہاڑی نالے میں تین رات اور دو دن اپنی بیوی اور دو گلاب جیسے پوتوں کو لئے چھپا رہا۔ لیکن دل

کے نہاں خانے میں یہ امید کی کلی برابر مہکتی رہی۔ اس نے سوچا تھا۔ ہندوستان پہنچتے ہی اس کے ہم مذہب اس کے قدم لینے کے لئے دوڑ پڑیں گے۔ اس کو گلے سے لگائیں گے۔ اس کے تلوؤں پر پڑے چھالے جواب پھوٹ کر زخم میں بدل رہے تھے۔ ان پر مرہم کے پھائے رکھے جائیں گے۔ اس نے سوچا تھا کہ دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ فرش پر نرم نرم مخمل بچھے ہوئے ہوں گے کہ جن پر پاؤں رکھتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔

لیکن سرحد پار کرنے کے بعد یہ سب کچھ خواب ثابت ہوا۔ اس نے ظلم اور بے دردیوں کو بہ دستور دیکھا۔ اس وقت اس کلی پر ایک ہلکا سا حزن، ایک دھول سی چھا گئی۔ لیکن چند لمحوں کے لئے پھر اس نے اس دھول کو جھاڑ دیا۔ اور کیمپ کی ضمیر کو مردہ کرنے والی روٹیوں پر تھوک کر اس شہر میں آ گیا اور اب نئے سال کا کلینڈر لے جایئے ساڑھے چھ آنے میں..... ساڑھے چھ آنے میں.....

آج اتوار کا دن ہے۔ آج وہ کچھ زیادہ توقع لے کر آیا ہے۔ وہ کئی ہفتوں سے ہر اتوار پر آسرا لگائے رہتا ہے۔ تاکہ اپنی بوڑھی بیوی جس نے رفاقت کے تیس برس اس کے ہمراہ بڑی تندی سے گزارے ہیں۔ اس کے لئے چار گز لٹھا خرید سکے۔ لٹھا نہ سہی مارکین سہی۔ وہ سات دنوں میں سینکڑوں بار بڑھیا کو یقین دلاتا ہے کہ اتوار کو ضرور کپڑا لے آؤں گا تیرے لئے۔ مگر وہ اتوار نہیں آتا جس کا اسے انتظار ہے۔ وہ اتوار جو اس کی مٹھی میں اتنے پیسے دے جس سے چار گز لٹھا خرید سکے۔ اور مجبوراً ایک ہی شلوار میں وہ دونوں گزر کر رہے ہیں۔ صبح جب وہ غم روزگار کا بھاری بوجھ لئے اپنے جھونپڑے سے باہر نکلتا ہے تو باہر سے دروازے کے اندر ہاتھ ڈال کر کہتا ہے۔ ''دے جلدی، بہت دیر ہو گئی تیکھے کی ماں، جلدی کر۔''

جواب میں تیکھے کی ماں اس کو اپنی شلوار پکڑا دیتی ہے۔ بوڑھا کھڑا کھڑا شلوار پہن کر گچھا اندر پھینک دیتا ہے اور کچھ کہے بغیر چل پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں خون کا ایک قطرہ کانپ اٹھتا ہے۔ اندرونی کرب سے چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اس کے دل میں ایک بھٹی اچانک سلگ اٹھی ہے۔ مگر وہ کسی سے شکایت نہیں کرتا اور چپ چاپ اتوار کے انتظار میں بازار کی سمت بڑھ جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے غموں کا بوجھ پٹک دیتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو باہر سے آواز دیتا ہے۔ ''تیکھے کی ماں، بہت دیر ہو گئی جلدی کر۔''

تنکھے کی ماں جو کئی ہفتوں سے دن بھر یا تو اپنے پوتوں کو لئے پڑی رہتی یا پھر دروازہ کی آڑ لے کر راہگیروں کو تکا کرتی ہے۔ آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کچھ باہر پھینک دیتی ہے جس کو پہن کر بوڑھا پھر شلوار واپس کر دیتا ہے۔

تنکھے کی ماں اب کے اتوار کو ضرور اچھا کمیشن ملے گا۔

تنکھے کی ماں کچھ نہیں کہتی اور چپ چاپ نل پر پانی لینے چل دیتی ہے۔ اس طرح ایک ہی شلوار سے دونوں کی گزر ہو رہی ہے۔

بوڑھا رفیوجی قول ہی میں نہیں عمل کے میدان میں مساوات کا قائل ہے۔

ساڑھے چھ آنے، پنڈت نہرو، نئے کلینڈر، تاج محل ساڑھے چھ آنے لے جایئے نئے سال کا کلینڈر..... مہاتما بدھ.....

مہاتما بدھ، جن کے لبوں پر ایک نورانی مسکراہٹ چمک رہی ہے۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایک ایک شے ایک ایک نقطے کو تک رہے ہیں۔ سرخ چہرے پر ایک تقدس ایک پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ قریب پہنچ کر میں نے آہستہ سے کہا ــــــ ''شہزادے کیا تمہیں سکون مل گیا؟''

شہزادہ کچھ نہیں کہتا۔ اس کے لب خاموش ہیں۔ مگر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا ہے۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کے شانے کو تھپتھپایا۔

سدھارتھ، آنکھیں کھولو..... کیا تمہیں وہ رات یاد ہے جب یشودھرا گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر نور کا ایک ہلکا سا سایہ منڈلا رہا تھا اور اس کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی۔ جسے آج لوگ زندگی کہتے ہیں۔ مفرور شہزادے! کیا تمہیں وہ مسکراہٹ وہ زندگی یاد ہے؟ وہ یشودھرا یاد ہے؟ وہ پیار وہ سچائی یاد ہے؟؟ یا سب بھول گئے؟؟''

لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی ــــــ نگر نگر پھرنے والے کہانی کار تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے سکون کو مت چھیڑو.....''

''مگر شہزادے زندگی موت کے سکون سے نہیں۔ زندگی کے شور سے عبارت ہے!''

''بس بس، اب تم یہاں سے چلے جاؤ..... یہاں سے چلے جاؤ۔''

جاتا ہوں سدھارتھ۔ مگر اب تم گھر لوٹ جاؤ۔ بہت دیر ہو چکی ہے کوئی وقت کی راہ پر نظریں گاڑیں صدیوں سے منتظر بیٹھا ہے۔

''کون ہے وہ؟''

سکون کی تلاش میں بھاگے ہوئے شہزادے۔ کتنے نادان بنتے ہو۔ وہ یشودھرا ہے۔ لوٹ جاؤ سدھارتھ، لوٹ جاؤ! یشودھرا زندگی کے روپ میں آج بھی تیرا انتظار کر رہی ہے.....''

نئے سال کا کلینڈر..... ساڑھے چھ آنے میں ایک..... نئے سال کا کلینڈر لے جائیں۔ مہاتما بدھ..... تاج محل..... شاہ جہاں.....

''شاہ جہاں۔''

ایک محل کا وسیع کمرہ ہے۔ جو قیمتی ایرانی قالینوں، اطلسی پردوں، چینی گلدانوں اور مختلف قسم کے سامان سے آراستہ ہے۔ طلائی پائیوں والی پلنگ پر شہنشاہ شاہ جہاں نیم دراز ہیں۔ قریب ہی آبنوس کی قیمتی کرسی پر مخملی لبادہ زیب تن کئے شاہی طبیب شہنشاہ کی نبض ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ آس پاس چند مصاحب دست بستہ و سرنگوں کھڑے ہیں پلنگ کے پیچھے طاؤس کے لمبے لمبے پنکھے لئے کنیزیں کھڑی ہیں۔ کنیزوں کے پیچھے سفید ریش والے چار مُلّا تلاوت قرآن میں مصروف ہیں۔ کمرے میں ایک لمبے لوبان دان سے عود و عنبر کا بیچ کھاتا ہوا دھواں اٹھ رہا ہے۔ شاہ جہاں کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ رنگ زرد ہے اور لبوں پر پپڑی جمی ہوئی ہے۔ چاروں طرف گہرا سکوت ہے۔ صرف شہنشاہ کی لمبی سانس ٹھہر ٹھہر کر چل رہی ہے۔ دبے دبے قدموں سے قیمتی قالینوں پر جن پر زری کا بہت باریک کام کیا ہوا ہے، چلتے ہوئے قریب پہنچ کر میں نے کہا۔

''عالم پناہ ــــــ!''

''کون ہے؟'' بڑی آہستگی سے جواب ملا۔

''ظلِ الٰہی میں ہوں۔ ایک کہانی کار ــــــ!''

''کہانی کار کا کیا مطلب ــــــ؟'' جہاں پناہ کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔

قریب ہی کھڑے ہوئے مصاحب نے کہا ''داستان گو ــــ، عالم پناہ۔''

''داستان گو۔ یوں کہو ــــــ اوہو داستان گو بڑے موقع پر تم آئے۔ میرا دل بہت اداس ہے..... اسے بہلاؤ..... کوئی قصہ.....''

''نہیں ظلِ سبحانی ــــ میں محلوں کا نہیں جھونپڑوں کا قصہ گو ہوں۔ گستاخی معاف عالم پناہ! میرے قصے آپ کو بہلانے کی جگہ اور بے چین کر دیں گے۔''

''تو پھر کیوں آیا ہے گستاخ! فوراً.....''

''میں صرف تاج محل کے اخراجات کا گوشوارہ جاننے آیا ہوں ظل سبحانی!''

''تاج! میری اُمیدوں کا سہارا— میری لازوال محبت کی یادگار..... مگر تم اس کا گوشوارہ کیوں جاننا چاہتے ہو۔ داستان گو؟''

''وہ صرف اس لئے کہ ایک بیوقوف رفیوجی اسے صرف ساڑھے چھ آنے میں بیچ رہا ہے۔''

سارے محل میں ایک شور گونج اٹھا— ''کوئی ہے؟ اس گستاخ کی زبان گدی سے باہر نکال پھینکو—''

''میں جلدی سے بھاگ آیا— بوڑھا رفیوجی بدستور چلا رہا ہے۔ ساڑھے چھ آنے میں لے جایئے۔ ساڑھے چھ آنے میں۔ آگرے کا تاج محل ساڑھے چھ آنے میں''

رفیوجی کے قریب کھڑا ہوا ایک دُبلا پتلا یرقان زدہ آدمی الگ چلا رہا ہے۔ ''بیلے کا ہار..... ناری کا سنگھار لے لو..... بیلے کا.....'' اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک تراشیدہ ٹکڑا ہے۔ اس میں بیلے کے ہار جھول رہے ہیں۔ سفید سفید پھول تاروں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کی نرم نرم پنکھڑیاں بارش کے قطروں سے نم ہوگئی ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو، ایک کیف، ایک نشہ، ایک سحر بن کر آس پاس پھیل رہی ہے۔ ''بیلے کا ہار..... ناری کا سنگھار۔ بیلے کا ہار.....''

کیچڑ اُڑاتی ہوئی ایک جیپ سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔ اس میں سے ایک بنگالی حسینہ اُتری۔ اس کے لانبے بال ایک بڑے سے جوڑے کی شکل میں پھول سے دکھائی دے رہے ہیں۔ بیلے کے ہار والا زور سے چلایا..... ناری کا سنگھار، ناری کا سنگھار— ''بنگالی حسینہ ہاروں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہار والا قریب آ گیا۔ پُر امید لہجے میں پوچھا۔ ''کتنے دوں حضور؟'' عورت کے پیچھے اس کا شوہر بھی آن کھڑا ہوا۔ عورت نے شوہر کو دیکھا۔ گویا پوچھ رہی ہے کتنے؟ شوہر نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا۔ ''مگر تمہاری بینی تو ہے!''

عورت نے بالوں کے جوڑے پر ہاتھ پھیرا— ''ہاں ہاں! ہار نہیں چاہیئے میرے پاس پلاسٹک کی بینی ہے۔'' اور آگے بڑھ گئی۔

ہار والا پھر منہ دوسری طرف پھیر کر چلا رہا ہے۔ بیلے کا ہار— بیلے کا ہار.....

ناری کا سنگھار.........''

مگر ناری تو اس دور میں پلاسٹک کی ہوگئی ہے۔ تو کیا گلا پھاڑ رہا ہے۔ بے حیا؟

بے حیا نے جواب میں کہا۔ ''میں رات سے بھوکا ہوں۔ میری بیوی نے چوتھے بچے کو جنم دیا ہے۔ بچے کی ماں کو بھی کھانے کو کچھ نہیں ملا ہے۔ میں دن بھر ایک آٹے کی مل میں کام کرتا ہوں اور رات گئے تک کمیشن پر یہ ہار بیچتا ہوں۔ پھر بھی میری بیوی کو پاؤ بھر دودھ نہیں ملتا۔ آج تین دنوں سے میرا بچہ ننگا پھر رہا ہے۔ آٹھ برس کا بچہ، کل تک اس کے بدن پر کچھ چیتھڑے تھے۔ پرسوں وہ چیتھڑے بچہ پیدا کرنے والی بے شرم بیوی کی ضرورت میں آگئے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا ــــ بیلے کا ہار ــــ ناری کا سنگھار ــــ مگر ناری تو..........

دھوپ کی کومل لجیلی کرنیں اپنے آنچل کو سکھا کر سہاگ رات منانے چلی گئی ہیں۔ سینما بلڈنگ کی دودھیا روشنی آس پاس پھیل گئی ہے۔ جیسے تاروں کی نیلاہٹیں بکھر گئی ہوں۔ چہل پہل میں اضافہ ہو رہا ہے............ سینما بلڈنگ کے آمنے سامنے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ایک طرف گپ چپ، دہی بڑے، پکوڑیاں بیچنے والے اپنے خوانچے لئے بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ اور زبان بیک وقت تیزی سے چل رہے ہیں۔ شاید بکنگ شروع ہو چکی ہے۔ کیونکہ سینما کے لاؤڈ اسپیکر سے مخصوص ہلکی موسیقی کی آواز آنے لگی ہے۔ فلم کے شوقین تیزی سے بکنگ آفس کی طرف آ جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ سینما گیٹ کی عین پیشانی پر لگے ہوئے رنگین پوسٹر کو بڑے اشتیاق اور تجسس سے تک رہے ہیں۔ جس میں ایک جوان عورت اپنے سینوں اور رانوں کی نمائش کر رہی ہے۔

کہیں سے بھٹکتا ہوا ایک نو عمر لڑکا بغل میں بوٹ پالش کا سامان لئے آ گیا ہے۔ لڑکا بہت کم سن ہے۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت ہے۔ اس لئے دیکھنے سے ایسا معلوم پڑتا ہے گویا وہ شہر کی کسی مل میں ملازم ہے۔ وہ عورت لڑکے کے ساتھ کچھ فاصلے پر چل رہی ہے۔ لڑکا سفید پوش آدمیوں کے قریب بڑے پیارے انداز میں کہتا ہے............ ''پالش کر دوں صاحب، آپ کے جوتوں پر پالش کر دوں۔ ایک دم سے چمکا دوں گا۔''

یہ سن کر سینما گیٹ کے پہلو والی بڑے بڑے آئینوں سے سجی ہوئی پان کی دکان کے قریب کھڑے ہوئے گجراتی سیٹھ کی نگاہ ایک بار اپنے جوتے کی طرف جاتی ہے۔ دوسری بار اس

میلے کچیلے بچے کی طرف —— بچے کی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے امید کی چنگاری چمک اٹھتی ہے۔اس نے بڑی توقع سے ہاتھ بڑھایا۔

''حضور کر دوں پالش؟''

سیٹھ نے پیر یوں پیچھے کھینچا گویا کوئی سانپ بڑھ رہا ہو۔

''ابے ہٹ ہٹ، سالا دیکھتا نہیں؟ میرا جوتا میلا ہو جائے گا۔ہم روز سویرے آپ پالش کرتا ہے۔بھاگ بھاگ سالا۔''

''بھاگ سالا دیکھتا نہیں، آج کل کوئلے کے بیوپار میں ہر مہینے گھاٹا ہو رہا ہے،کلکتہ کی تین بائیوں کو مجبوراً چھوڑ دینا پڑا ہے۔سال میں کار کے صرف تین ہی ماڈل بدلے جاتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے پالش کرنا پڑتا ہے۔اور تو چاہتا ہے گجراتی سیٹھ ایک دم سے کنگال ہو جائے؟''

لڑکا ہٹ گیا۔اور گاڑی میں اونگھتے ہوئے شوفر کی طرف پرامید نظروں سے دیکھتا ہے۔جس کے جوتے چھونے سے شاید میلے نہ ہو جائیں گے۔مگر اسے اونگھتا ہوا دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

''بوٹ پالش، بوٹ پالش......''جیسے بلبل چہک رہی ہو۔

''بچے، تم نے اتنی چھوٹی عمر میں ہی کیوں زندگی کے جھمیلے کو اپنا لیا ہے؟ نوعمر بچے تم اسکول کیوں نہیں جاتے؟''

''آپ کے بھیجے پر پالش کر دوں صاحب؟''

''ارے لڑکا! تو بڑا گستاخ معلوم ہوتا ہے!''

''سائے کی طرح ساتھ رہنے والی ادھیڑ عورت قدرے مایوسی سے لڑکا کی طرف دیکھ رہی ہے۔

''یہ عورت کون ہے بچے؟ یہ تمہارے ساتھ سائے کی طرح کیوں لگی ہوئی ہے؟''

''یہ میری ماں ہے۔یہ میرے باپ کی کھوج میں ہر روز میرے ساتھ شہر آتی ہے یہ پگلی ہے۔میرا ننھا بھائی بیمار پڑا ہے۔یہ اس کا بھی خیال نہیں کرتی۔''

جب گاؤں میں کال سا پڑنے لگا۔اور کئی کئی دنوں تک چاول کی شکل تک دیکھنی نصیب نہ ہونے لگی۔چاول جسے اس کے اور اس کے شوہر کے ہاتھوں نے بویا تھا۔سینچا تھا، کاٹا تھا......

.....چاول جو اَب اس کے قبضے میں نہیں تھا۔ گاؤں کے صدیوں پرانے لٹیروں کے تصرّف میں تھا۔ چاول جو صرف ایک یاد، ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی راتیں مسلسل بھوک سے سائیں سائیں کرتے ہوئے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالنے لگیں۔ اس وقت سنی سنائی باتوں میں آ کر اس کے شوہر نے ایک دن بیوی سے کہا" کیوں نہ وہ شہر چلا جائے، جہاں کے کارخانوں میں اتنی مزدوری مل جاتی ہے کہ ایک آدمی کمائے اور تین کھائیں یہ سن کر اس کی بیوی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا کہ دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہو سکتی ہے جہاں ایک آدمی کی کمائی میں تین آدمیوں کو کھانے کو مل جائے۔ مگر جب اس کے شوہر نے اچھی طرح یقین دلایا اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے قصّے سنائے جو شہر میں موج اڑا رہے تھے تو وہ خوشی سے جھوم اُٹھی اور اپنے تیسرے یعنی سب سے چھوٹے بچے یعنی جو زندگی کے میدان میں کڑی دھوپ بن کر آیا تھا، کو چوم لیا۔ اور اسی دن مکئی کا ڈھیر سا ڈنٹھل لے کر شوہر کے ساتھ چل پڑی۔

لیکن شہر پہنچ کر وہ بہت مایوس ہوئی۔ یعنی چالیس میل تک جس امید کو وہ سنبھالے چلی آئی تھی وہ مایوسیوں کی آگ میں جل گئی۔ پھر انتھک دوڑ دھوپ کے بعد بالآخر ایک کارخانے میں میاں بیوی کو کام مل گیا۔ مگر دن بھر کی کڑی محنت کے بعد بھی بھر پیٹ کھانا میسّر نہ آیا۔ پھر بھی وہ خوش تھی پھر بھی اس کے لبوں پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ پھر بھی اس کی آنکھیں نم نہ ہوئیں۔

پھر ایسا ہوا کہ گاؤں کے لوگ بھاری تعداد میں شہر آنے لگے اور کارخانے کے گیٹ پر ایک جمِ غفیر رہنے لگا۔ اور یوں مقررہ مزدوری میں کمی ہونے لگی۔ اور ہوتے ہوتے اتنی رہ گئی کہ تین کمائیں تو ایک کا بھی پیٹ نہ بھرے، تو اچانک کارخانوں میں ہڑتال ہو گئی۔

اور چاول کے دانے ایک دم سے چھن گئے۔ اور جہنم کی آگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

بھوکے بچّوں کی چیخیں بڑھتی گئیں۔ ہڑتال کی مدت میں اضافہ ہوتا گیا اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ آتی گئی۔ اور جب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی نہ رہا تو ایک رات جب اس کی بیوی سو رہی تھی اور بچے چیخ چیخ کر تھک کے اپنی ماں کے جسم سے چمٹے ہوئے تھے۔ اور آئندہ صبح کو ہڑتال کرنے والوں کی طرف سے ایک جلوس نکلنے والا تھا۔ اس کے سائیں سائیں کرتے ہوئے دماغ میں نہ جانے کیا سمایا، نہ جانے کیا سوچ کر وہ بہت پریشان ہوا تھا۔ اور اسی رات کو اس کے لرزتے ہوئے قدموں نے شہر کو چھوڑ دیا۔

پھر کلکتہ جا کر اس نے ایک جوٹ مل میں ملازمت کر لی۔ مگر ابھی ملازمت کے دس ہی دن گزرے تھے کہ چھٹائی ہوگئی اور وہ پھر بے کار ہو گیا۔ کئی ہفتوں تک آوارہ پھرنے کے بعد ایک روز سونا گاچھی میں اس نے اپنے ضمیر کو موت کی نیند سلا دیا۔ اور اب رات رات بھر رنڈیوں کی دلالی کرتا ہے اور دن بھر شراب کے نشے میں غرق ہو کر وہیں پڑا رہتا ہے۔ اور فحش فلمی گیت گاتا رہتا ہے۔ اور اس کی بیوی کارخانے سے فرصت پا کر ہر شام اپنے لڑکے کو پالش کا بکس دے کر اس کے ساتھ ساتھ شوہر کی کھوج میں سڑکوں پر انتظار کرتی ہے۔

''اور چائے لاؤں حضور؟'' بیرا پھر مجھے سینے ویو کے ماحول میں کھینچ لایا۔

''ہاں لے آؤ۔۔۔''

سینے ویو میں بدستور شور جاری ہے۔ پلاسٹک کی خوبصورت عورتیں اپنے سعادت مند جھوٹے چاہنے والوں کے ساتھ جھوٹی محبت کی جھوٹی باتوں کا دفتر لئے پاگل ہوئی جا رہی ہیں۔

''ڈارلنگ! میں نے تمہاری جدائی میں آنسوؤں کے سمندر بہائے ہیں۔ دیکھو دیکھو ۔۔۔ابھی تک میری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔''

''میں نے ایک ایک دن ایک ایک صدی کر کے گزارے ہیں۔ میں نے کئی بار خودکشی کا بھی فیصلہ کر لیا تھا ڈیر۔''

''اوہو۔۔۔ہوہ..... ڈارلنگ یوں نہ کہو۔ مجھے غش آجائے گا۔ میں نے خود تڑپ تڑپ کر تین مہینے دارجلنگ میں کاٹے ہیں۔''

کوئی نہیں کوئی نہیں ——— بے جان، کھوکھلے، جھوٹے آنسو، جھوٹی مسکراہٹیں سارے سینے ویو میں گھٹن سی چھا رہی ہے۔ ارکسٹرا پر ایک نئی دھن شروع ہو گئی ہے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے پیر تھرک رہے ہیں۔ کوئی دیر میں رقص شروع ہو جائے گا جسم سے جسم ملیں گے اور سارے ہنگامے شراب اور رقص کے نشے میں مست ہو کر ''بار'' کے تاریک کہروں میں سو جائیں گے۔ اور جھوٹی زندگی کے جھوٹے آثار کھوئے ہوئے بگولوں کی طرح تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیں گے۔ شراب کے نشے میں دھت جوڑے جب رات گئے جاگیں گے۔ اور رات دن نئی مل، نئی کان، نئی بلڈنگ اور بلیک مارکیٹ کی نئی اسکیم بنانے والے والدین کا جب انہیں خیال آئے گا اور خالی جیبوں کی طرف ہاتھ جائے گا تو وہ بگٹٹ بھاگیں گے۔ پاؤڈر اور کریم کی

تہوں کے نیچے چھپے ہوئے چہروں پر موت کی سی اداسی چھا جائے گی۔ اور اس وقت جھوٹی محبت کی ساری دل نواز باتیں۔ فراق کے شکوے، جدائی میں بہائے گئے آنسوؤں کے سیلاب سب کچھ ایک بھولا ہوا خواب بن چکے ہوں گے۔ اور پلاسٹک کی عورتیں رس گلّوں اور شراب کے ذائقے سے محروم لبوں پر زبان پھیر پھیر کر اپنے چاہنے والوں کے اُکتائے ہوئے بازوؤں کا سہارا لئے خوبصورت کاروں میں بیٹھ کر اپنے اپنے ڈربوں کو چل پڑیں گی۔

دل واقعی اداس ہوتا جا رہا ہے۔ دل ناداں کو کیا سمجھاؤں۔ اس کم بخت کو سینے ویو میں بھی زندگی کی تلاش رہتی ہے۔

میں نے پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ جہاں ادھیڑ عمر عورت اپنے دکھوں کا بوجھ لئے اپنے مفرور شوہر کی تلاش میں ایک نالی کے قریب بیٹھی ہوئی ہے۔

زندگی سے بھاگے ہوئے سدھارتھ! گھر لوٹ آؤ ——— یشودھرا زندگی کے روپ میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

○○

بابے

"یہاں بابے کی بات پر کوئی غصہ نہیں ہوتا۔" دفعتاً پیچھے سے ابرار نے میرے کندھے پر محبت سے یوں ہاتھ رکھ دیا کہ میں متحیر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

محلّے میں جس گندے کبابۓ کو دیکھتے ہی کراہت سے آنکھیں بند کرلیا کرتا تھا۔اور اپنے عزیز دوست ابرار کے لاکھ اصرار کے باوجود جس کے یہاں کباب کو چکھنا تو دور کی بات ہے اس کی جانب نظر اُٹھا کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔آج کئی گھنٹے کی بارش کے بعد جب سردی پھٹ پڑی تو پتہ نہیں وہ کراہت کہاں کافور ہوگئی۔اور غیر ارادی طور پر میرے پاؤں اُس کی دکان کے قریب تھم گئے۔

"کلّو بھائی! کباب دینا، دو سیخ کے۔"

اونگھتے ہوئے کلّو کبابۓ نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھائی اور خمار آلود آنکھوں سے مجھے اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے قدرے تعجب سے بولا: "آپ کھائیں گے جی؟"

"ارے نہیں کلّو بھائی.........." میرے قریب کھڑے ہوئے ایک عجیب سے آدمی نے یوں جواب دیا گویا کلّو کبابیہ اسی سے مخاطب تھا—— آپ اپنے کتے کو کھلائیں گے......

......"پھر اچانک اس معمر آدمی نے میری طرف دیکھا اور دفعتاً یوں قہقہہ لگانے لگا کہ میں نے یوں محسوس کیا گویا کسی مکان کی ٹین والی نشیب چھت پر بہت سے پتھر گر۔نے لگے ہوں۔ ذرا دیر ہنس کر وہ اسی طرح اچانک سنجیدہ ہوگیا پھر میری طرف ذرا جھک کر سرگوشیوں کے انداز میں کہا—— "گھر لے جا کر تو خود ہی کھاؤ گے بابو یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ پر یہاں تو یہی کہو.........."

میں بھونچکا ہوگیا اور قبل اس کے کہ اپنے آپ کو سنبھال کر کوئی جواب دوں کہ پھر ٹین والی نشیب

چھت پر پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔

کلو کبابئے نے ایک نظر اس شخص پر ڈالی، پھر بڑی بے اعتنائی سے مجھے دیکھتے ہوئے اینٹوں کے سہارے لکڑی کی دھیمی آنچ پر رکھی ہوئی کباب کی گندی سیخوں کو اٹھایا۔ پھوں پھوں کر کے اس پر پھونکیں ماریں۔، پھر تیل سے چپڑے ہوئے کاغذ سے پکڑ کر سیخوں کے کباب کو یوں کھینچ لیا جیسے دادی اماں کی سنائی ہوئی الف لیلوی داستان میں بادشاہوں کے حکم سے جلاد مجرموں کی کھال کھینچ لیا کرتے تھے۔

''ان کی ہنسی کا خیال نہ کیجئے گا بابو، یہ تو.....''

ذرا میں نے سنبھالا لیا تو عین اسی وقت غصّے کی ایک لہر نے میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور ابھی میں اس اجنبی کی طرف پلٹا بھی نہیں تھا کہ ابرار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گویا کوئی گہرے راز کی بات پر سے پردہ سرکا رہا ہو۔ اس کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''تم ابھی نئے نئے آئے ہو اس محلّے میں، اسی لئے اجنبیت محسوس کر رہے ہو ذرا رہ لوگے ان لوگوں میں تو مانوس ہو جاؤ گے..... تانبے کی تھالی پر جب پہلے پہل چوٹ پڑتی ہے تو کیسی جھنا کے کی آواز آتی ہے۔ پھر یہی آواز مسلسل ضربوں کے باعث سکون پسند تھپ تھپ میں بدل جاتی ہے.....''

میں نے کلو کبابئے سے کباب لئے۔ جیب سے ایک دونّی نکال کر اس کی طرف اچھالتے ہوئے ابرار کے ساتھ سڑک پر آ گیا۔

''کیا بابے یہاں کے بادشاہ ہیں؟''

''شاید بادشاہوں کے بادشاہ، شہنشاہ ــــــ بیلے والی گلی دیکھی تم نے؟'' پھر ابرار نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا۔ ''نئے نئے آئے ہو محلّے میں، نہیں دیکھی ہوگی۔ بیلے والی گلی سے مڑو گے تو بائیں طرف میونسپلٹی کا ایک بہت پرانا نالہ ملے گا.....''

میں نے اُکتاہٹ سے بائیں ہاتھ والی کباب کی پُڑیا کو دائیں ہاتھ میں پلٹا اور جھنجھلا کر ابرار کے ہاتھ کو اپنے شانے سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''بات تمہارے شہنشاہ کی ہو رہی تھی میونسپلٹی کی نہیں۔''

ابرار نے اپنی بھینچی ہوئی مٹھی کو میرے قریب لاکر کہا۔ ''دیکھو بات کے سرے کو میں اچھی طرح پکڑے ہوئے ہوں — تانگہ الٹا تو اس میں بیٹھا ہوا علی بخش ٹھیکیدار بھی میونسپلٹی کے اسی نالے میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ پاس ہی بابے کھڑا تھا۔ جب تانگہ، اس کا کوچوان اور اس کے نیچے علی بخش ٹھیکیدار تینوں کے تینوں نالے میں گر پڑے تو ذرا اور قریب بڑھ کر بابے نے اتنے زور سے قہقہے لگائے کہ آس پاس کے درختوں کے پرندے بھی پھڑ پھڑا کر پرواز کرنے لگے۔ اور پھر لوگوں کو بلا بلا کر جمع کرنے لگے۔ اور بدستور ہنسنے لگے —— ''آج بھولے بھٹکے کو راہ مل گئی بھائیوں! آج بھولے بھٹکے کو راہ مل گئی.....''

لوگوں نے لپک کر تانگے کو، کوچوان کو، پھر علی بخش ٹھیکیدار کو باہر نکالا۔ اور ابھی ٹھیکیدار مبہوت سا کھڑا دو چار سانس بھی نہیں لینے پایا کہ بابے نے جیب سے ایک چونی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی —— لے، لے ٹھیکیدار یہ تیرا انعام ہے.....''

پہلے تو علی بخش ٹھیکیدار نے بوکھلاہٹ اور پریشانی کے عالم میں چونی لے لی۔ پھر جب قریب کھڑے لوگ دفعتاً ہنسنے لگے تو وہ چونکے اور پلٹ کر ایک زوردار طمانچہ بابے کو یوں رسید کیا کہ پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھ آپ ہی آپ اپنے گالوں کو سہلانے لگے۔

لوگ دنگ کہ یہ کیا ہوا۔ اور اب انہیں کیا کرنا چاہیے کہ بابے جس تیزی سے گرے تھے اسی پھرتی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔ ''علی بخش پھر گرے گا!''

کہتے ہیں کہ اسی دن جو علی بخش کے داہنے ہاتھ میں درد سمایا کہ تیرہ مہینے بعد اس کے بازو کو تراشنے کے بعد ہی دور ہوا.....''

سامنے ایک کچی نالی تھی۔ جس میں ہفتوں کی کیچڑ کے باعث بارش کا پانی رک کر بجبجا رہا تھا۔ ابرار نے ہاتھ کے اشارے سے، چلتے چلتے مجھے روکا، پھر ذرا سی چھلانگ لگا کر نالی پار کر گیا۔ گویا مجھے اپنے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی۔ مگر میں بڑی آہستگی اور اطمینان سے نالی کو پھلانگ کر دوسری طرف آ گیا۔

''توہم پرستوں کے نزدیک اتفاقات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بابے ایک بدتمیز آدمی ہے۔ لوگوں کی تضحیک کر کے اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جس دن اسے سزا مل گئی۔ سمجھو کے بابے کی بادشاہت ختم.....''

ابرار نے تڑپ کر دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
''توبہ توبہ! ایسا نہیں کہتے۔ تم میرے یار ہو۔ مجھے چاہے گالیاں دے لو؟ چاہے جوتا مار لو، مگر بابے کے متعلق جو کچھ بولو سوچ سمجھ کر بولو۔''

''ورنہ ــــ؟''

''ورنہ پتہ نہیں آج ہی کی رات کو تمہیں کچھ اُلٹے سیدھے خواب نظر آئیں۔''

مگر رات مجھے اتنی گہری نیند آئی کہ صبح ہی کو آنکھ کھلی۔ پلٹ کر پہلو والی چارپائی پر نظر ڈالی تو سلطانہ کو بھی گہری نیند کے مزے لیتے ہوئے پایا۔ سلطانہ کی نیند اتنی گہری اور پیاری لگی کہ میں نے اسے جگانے کے خیال کو ترک کر دیا اور باہر نکل آیا۔ ابھی آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ مگر صبح کی روشنی میں کل دن بھر اور آدھی رات تک کی بارش میں بھیگی ہوئی دنیا بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ آسمان میں اب بھی جہاں تہاں بادل کے ایک آدھ ٹکڑے ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگے جا رہے تھے۔ جن کے عقب میں لاجوردی آسمان کسی ایرانی حسینہ کی آنکھوں کی گہری نیلی جھیل کی طرح دلنواز لگ رہا تھا۔

میرے مکان کے سامنے سڑک تھی۔ سڑک کے پار میونسپلٹی کا کوڑا پھینکنے والا ٹب تھا۔ جس میں پتہ نہیں کتنے مہینوں کی گندگی بجبجا رہی تھی۔ ہوا کا تیز جھونکا گزرا تو اس کے ساتھ ٹب کی گندگی کی ناقابلِ برداشت بو نے میرے نتھنوں میں آگ لگا دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک جوان لڑکی چھائی سے بھری ہوئی کانسے کی تھالی ٹب میں اُلٹ رہی تھی۔ جب وہ چولہے کی راکھ ٹب میں پلٹ چکی تو بائیں ہتھیلی کی پشت سے اپنے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سر کی طرف کرتے ہوئے سامنے والے پختہ مکان کو دیکھا اور ڈھل ڈھل رونے لگی۔ صبح کی ملگجی روشنی میں اکہرے بدن کی یہ گوری ناری لڑکی مجھے پتہ نہیں کیوں اتنی خوبصورت اور دلآویز لگی کہ میں اپنے آپ کو خوب صورت خوابوں کی دنیا میں محسوس کرنے لگا پھر فوراً ہی مجھے لڑکی کے یوں اس طرح منہ اندھیرے رونے پر تعجب ہوا۔

لڑکی کی نظر پختہ مکان کی طرف سے پھسلتی ہوئی نیچے اتری تو مجھ پر ٹک گئی وہ ایک دم سے گھبرا گئی اور اچانک اس کے ہاتھ سے راکھ والی کانسے کی تھالی گر پڑی۔ اس نے ہڑبڑا کر سر پر آنچل کھینچا۔ جھک کر تھالی کو اٹھایا اور آنسو خشک کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتی ساتھ والی گلی

میں ہولی۔

وہ جو نرم اور قیمی چمڑے کے جوتوں میں سبک خرامی سے چلتے چلتے آدمی اچانک جوتے کے تلے میں کسی چبھتی ہوئی کیل کو محسوس کر کے لنگڑانے لگتا ہے وہی کیفیت میرے تخیل کے بہاؤ بھی محسوس کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد میں نے اپنے تخیل کے سبک خرام قیمتی جوتوں میں سے ابھری ہوئی وہ نوکیلی کیل نکالی، جب بھی احساس کے تلوؤں میں ہلکی ہلکی چبھن موجود تھی۔

آسمانوں سے، بھوری زمین کی طرف پلٹا تو پہلو والے نیم کی جھومتی ہوئی شاخوں سے ایک ٹہنی توڑ کر منہ دھونے کی خواہش ہوئی۔ میں پستہ قد اور شاخ بلندی پر ——— دو تین بار اُچک اُچک کر شاخ کو تھامنے کی کوشش کی۔ جب بھی ناکام رہا کہ اتنے میں دیکھا، شاخ خود بہ خود جھکتی جھکتی میرے ہاتھوں کو چھونے لگی۔ فوراً ابرار کے بیان کردہ بھیانک خوابوں کے خیال نے ایک لمحہ کے لئے چونکا سا دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو بابے شاخ کو تھامے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''ہر آدمی شاخ کو تھوڑی پا سکتا ہے بابو!''

بابے نے اچانک یوں سنجیدگی سے کہا اور اس کا چہرہ یوں لمحہ بھر کے لئے سیاہ پڑ گیا کہ میں چونک سا اُٹھا۔ خمیدہ شاخ سے میں نے حسبِ ضرورت ٹہنی توڑی اور جیب سے چاقو نکال کر تراشتے ہوئے جواب دیا۔

''شاخوں کا کیا بابے، ہوا نے جدھر زور دیا، ادھر ہی جھک گئی.....''

''پتہ نہیں بابے نے اتنی سنجیدگی سے کیا کہا تھا، اور شاید سامنے کھڑے ہوئے افسردہ سے بابے کو بھی میرے فقرے کے معنی کی خبر نہ چلی ہو۔ اس نے کہا—— ''بابو، میں اپنی بات کر رہا تھا.....'' اس کا چہرہ اور بھی بدنما ہو گیا گویا دل کا سارا اندھیرا چہرے میں اُتر آیا ہو۔

''میں بھی آپ ہی کی بات کر رہا تھا بابے— کل رات جب ہوا کا رُخ دوسری طرف تھا تو تم نے خواہ مخواہ لوگوں کے سامنے میرا مذاق اُڑایا۔ اور اب یوں سنجیدگی سے باتیں کر رہے ہو۔ جیسے لوگوں کی پگڑیاں اُچھالنے والا محاورہ بھی نہیں سنا ہو۔''

بابے نے کوئی جواب دینے کی بجائے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور میری طرف پلٹے بغیر تیزی سے پہلو والے مکان کے اندر چلا گیا۔

باہر سے دانتن کرتے ہوئے میں اندر پہنچا۔ تو سلطانہ بیدار ہو چکی تھی۔ اور چولھا

جلانے میں مصروف تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر بغیر مڑے ہوئے اس نے کہا۔

''بے چارہ پاگل ہے شاید!''

''کون پاگل ہے؟''

''وہی بابے جس سے آپ باتیں کر رہے تھے۔''

''ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ لوگوں کو پاگل بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہو۔'' پانی سے لبریز ڈرم سے لوٹا بھر پانی لے کر کُلّیاں کرنے لگا۔

''ارے نہیں۔ اسے کس بات کی کمی ہے۔ سامنے والا پختہ مکان ہے نا—— جس میں تین دکانیں ہیں وہ انہیں کا ہے۔ ایک سو روپے کرائے کے آتے ہیں۔'' سلطانہ چولھے میں پھونک مار مار کر اسے سلگانے لگی۔ ذرا دیر بعد جب چولھے سے لال لال شعلے پھر پھرانے لگے تو اس نے پانی سے بھری کیتلی اس پر رکھ دی—— ''آپ کے لئے چائے بنا دیتی ہوں پہلے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ بابے کو سو روپے.....؟''

سلطانہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''محلّے والے کہتے ہیں..... لوگ اُن کا جھوٹا پانی لے جاتے ہیں اور مریضوں کو پلاتے ہیں تو بیمار اچھے ہو جاتے ہیں۔ بابے خود پانی نہیں دیتے۔ بلکہ ان کے سامنے سے جھوٹے پانی کے گلاس کو لے جانے والوں سے چھین کر پانی پھینک دیتے ہیں۔ اس لئے لوگ ان سے چرا کر ان کا جھوٹا پانی لے جاتے ہیں.....''

سلطانہ نے چولھے کی راکھ کے ایک ٹکڑے کو ہتھیلی پر رکھ کر انگلیوں کی مدد سے اس کا سفوف بنایا اور اس سے دانت مانجھنے لگی۔ ''واللہ اعلم بالصواب'' ذرا توقف کے بعد اس نے پھر کہا، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بابے ہی سے میری برسوں کی مراد.....''

میں نے ہنستے ہوئے سلطانہ سے کہا ''عورتوں کے ناک نہ ہوتی تو جانتی ہو کیا ہو.....؟''

سلطانہ نے بھی ہنستے ہوئے اپنی ناک آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میری تو ناک ہے۔ دیکھئے کتنی لمبی لمبی، بہ قول آپ ہی کے ستواں ناک..... مگر جب آپ آفس چلے جاتے ہیں۔'' سلطانہ یک دم سے سنجیدہ ہوگئی۔ میں نے سوچا اب وہ پھر ناک ہی کے بارے میں کچھ بولے گی۔ مگر اس نے تو کچھ اور ہی کہا۔ ''جانتے ہیں اس وقت گھر کیسا سونا سونا لگتا ہے.....''

پھر وہ اپنے تین سالہ مرحوم بچے کو یاد کر کے رونے لگی۔

زندگی ایک ایسی اونچی شاخ تھی جس تک سلطانہ کے ہاتھ نہیں پہنچ پائے تو وہ فرش سے اُچک اُچک کر اسے پکڑنے کے پھیر میں تماشہ بنی ہوئی تھی۔ ایسے میں کہیں سے کوئی دراز قد بابے آجائے اور اپنے لمبے ہاتھوں کی مدد سے اس شاخ گل کو جھکا دے تو معجزہ ہی ہو جائے۔ پھر تو سلطانہ کے سنسان آنگن میں زندگی پھول بن کر بکھر جائے۔

مگر محلے کا یہ دراز قد بابے کوئی صاحب اعجاز نہیں۔ ایک پرلے درجے کا بے ہودہ اور مسخرہ تھا۔ اس کی بے ہودگی اور مسخری کے شریف لوگ شکار تھے۔ اور اس کے طرز عمل سے نالاں، حتیٰ کہ محلے کی شریف عورتیں بھی بابے کے تکلیف دہ مسخرے پن سے محفوظ نہ تھیں۔

چنانچہ یہ واقعہ چشم دید ہے۔ اس دن میں دفتر سے چھ گھنٹے کی کڑی مصروفیت کے بعد بے حد تھکان محسوس کر رہا تھا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور پاؤں، یوں محسوس ہو رہا تھا گویا من من بھر کے ہو گئے ہیں۔ میرے آفس کے پاس ہی لب سڑک چائے خانہ تھا اور میرا گھر اس چائے خانے سے کہیں دور۔ چنانچہ خلاف دستور میں چائے خانے میں گھس گیا۔ پاؤں سمیٹ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک پیالی چائے کی فرمائش کی تو چائے خانے کے تمام چھوٹے بڑے ملازموں کے ساتھ خود میر حسین میاں کو سڑک پر نگاہیں ہی نہیں بلکہ حواس خمسہ کو بھی مرکوز کئے ہوئے پایا۔ وہیں ایک طرف بنچ پر بابے بیٹھا ہوا تھا۔ ذرا تجسس کے ہاتھوں میں نے بھی گردن اٹھائی تو کولتار کی سیاہ ہموار سڑک کے بیچوں بیچ روپے کے ایک سکّے کو پڑے ہوئے پایا۔ یوں سڑک پر نظروں کے سامنے روپے کا پھینکا رہنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مگر تھی کوئی بات کہ لوگ اس روپے کو اٹھانے کی بجائے آنے جانے والے راہگیروں کو یوں تک رہے تھے گویا متوقع ہوں کہ وہ شخص ضرور اُٹھالے گا۔

میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے ذرا بیزاری سے کہا۔

"دیکھتے نہیں ہو بابے نے مذاق کیا ہے۔ روپے کو لوہے کی سیخ سے سڑک پر ٹھوک دیا ہے۔ ابھی کوئی سر پھرا اٹھانے لگے گا تو....."

ابھی میرے پہلو والے شخص کی بات ختم بھی ہونے نہ پائی تھی کہ ایک برقع پوش خاتون آکر ٹھیک روپیہ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ایک ثانیہ کے لئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہوٹل والے

لوگ بہ ظاہر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے پھر روپیہ کو ٹھوکر سے مارا۔ جب بھی روپیہ نہیں ہلا جھپاک سے جھک کر اسے اٹھانے لگی۔ روپیہ ایک لمبی کانٹی سے گڑا ہوا تھا۔ برقعہ پوش خاتون سے آسانی سے اُٹھا نہیں تو وہ زور زور سے انگلیوں کی مدد سے گڑے ہوئے روپیہ کو نوچنے اور بھنبھوڑنے لگی۔ ادھر لوگ منہ پر ہاتھ رکھے، کوئی رومال ٹھونسے، ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال ہو رہے تھے۔ اتنے میں بابے نے آگے بڑھ کر بڑے مخلصانہ لہجے میں خاتون سے کہا۔ ''میں اٹھا دوں بی بی؟'' اور بے تحاشہ قہقہہ لگانے لگا۔ برقعہ پوش خاتون گھبرا کر بدحواسی کے عالم میں دوبارہ اٹھی اور سڑک کے ایک پتھر سے الجھتی ہوئی ایک طرف کو بھاگی.....

بابے کے خلاف نفرت جو کئی دنوں سے میرے سینے میں ننھی سی پھنسی کی مانند ابھر آئی تھی۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے وہ پھنسی یک دم سے پھوڑے کی شکل میں تبدیل ہو گئی تھی۔ عین اسی وقت مجھے سلطانہ یاد آئی۔ جس نے بابے کو ایک خدا رسیدہ بزرگ کے روپ میں دیکھا تھا۔

چائے خانے سے نکل کر میں گھر کی طرف بڑھا تو میرے ذہن میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے سوچا، کہ ابھی ابھی جب میں سلطانہ کو بابے کی اس بے ہودگی اور غیر شریفانہ حرکت کے متعلق بتاؤں گا تو شاید وہ مشکل سے میری بات کو باور کرے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اسے بھی بابے کی مجذوبانہ شوخی قرار دے کر خداوند قسم سے اور نزدیک کر بیٹھے۔

مگر خلاف توقع سلطانہ کے خیالات میں خود ہی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ زمین آسمان کا فرق۔ کھانے پر پنکھا جھلتے ہوئے اس نے بتایا کہ دراصل بڈھا جنونی ہے۔ اس نے ساری کے پلو کو شانے پر پٹکتے ہوئے کہا۔ ''نصیبن کہہ رہی تھی۔ بابے عمل کر رہا تھا کہ ثابت قدم نہ رہ سکا۔ چنانچہ جن کو اپنے قبضے میں لانے کی بجائے خود جن کے قبضے میں چلا گیا۔ لوگ چالیس دنوں تک ایک دائرے کے اندر نصف رات تک وظیفے کرنے بیٹھتے ہیں۔ جب وظیفے کے ۳۵ دن گزر جاتے ہیں تو ۳۶ ویں دن سے عجیب عجیب آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ جن حضرت مختلف بھیس بدل کر سامنے آتے ہیں تاکہ وظیفہ خوار کسی طرح دائرے سے باہر آ جائے۔ ۳۹ ویں تک تو بابے دائرے کے اندر بیٹھا گردن جھکائے وظیفے میں محو، ہولے ہولے مسکراتا رہا۔ مگر عین ۴۰ ویں دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اسی دن شام کے دھندلکے میں بابے نے اپنے بیٹے فجو کو نیم کے سائے تلے سکینہ سے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی دن اس پر فجو اور سکینہ کے عشق کا راز افشاء ہوا تھا.....'' سلطانہ

نے ہانڈی سے دو اچھی اچھی بوٹیاں چن کر میری پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا—— کہتے ہیں اس لڑکی سے خود بابے کا معاشقہ چل رہا تھا.....''

''اسی لڑکی سے بابے کا..... یعنی باپ بیٹے دونوں کا عشق ایک ہی لڑکی سے.....!'' میں نے تعجب سے کہا، ''بکتی ہو۔''

''بکتی نہیں ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ محلے کی کئی عورتیں کہتی ہیں.....''

''خیر، پھر کیا ہوا؟'' میرا اشتیاق بڑھا۔

رات گئے جب بابے عمل کے آخری یعنی ۴۰ ویں دن وظیفہ میں غرق دنیا و مافیہا سے بے نیاز دائرے کے اندر آنکھیں جھکائے بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے اس کے کان کے پاس آہستہ سے سرگوشی کی کہ سکینہ اور فجو تالاب کی طرف.....

بابے نے آنکھیں کھولیں اور تڑپ کر دائرے سے باہر ہو گیا۔ رقابت کی آگ میں جل کر وہ سلگ اٹھا اور اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ عمل کر رہا ہے اور ایسے وقت اسے دائرے سے باہر نہیں آنا چاہیے۔ ابھی بابے کو کھڑے ہوئے لمحہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ کہیں سے زوردار قہقہے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ قہقہہ لگانے والا، نہ ہی وہ شخص جس نے چند سکنڈ پہلے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی اس نے گردن گھما کر چاروں اور دیکھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ لوگ گھروں میں دبکے ہوئے پڑے تھے۔ باہر چاروں سمت خاموشی، بڑی بھیانک، ایسے میں تیز ہوا کا جھونکا کبھی درختوں کی پتّیوں کو چومتا ہوا گزرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے بے شمار متنفس سانسیں لے رہے ہیں۔ جب بابے نے اپنے آپ کو اس عالم میں دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ دائرہ سے باہر ہے اور کوئی بھیانک قہقہہ ابھی اس کی سماعت سے ٹکرا کر گزرا ہے اور کسی نامعلوم بلکہ غیر مرئی شخص نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی ہے۔ تو وہ سہم گیا۔ اس کے پاؤں لرزنے لگے۔ اور ذرا دیر بعد وہ بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہا.....

سلطانہ ذرا رکی تو میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یک دم داستان طرازوں کی طرح بولتی ہو سلطانہ — پتہ نہیں نصیبن نے کیا کچھ تم سے بتایا ہوگا۔ اور اب تمہارے بلند پرواز تخیل نے اس واقعہ کو الف لیلوی حیثیت بخش دی ہے.....''

''گویا میں بکتی ہوں؟'' سلطانہ ناراض ہو گئی۔ اس نے ہاتھ والے پنکھے کو زور سے فرش

سے نپٹا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''عمل کرنے والے لوگ ایسے ہی پاگل ہو جاتے ہیں۔ جن انہیں اپنے قبضے میں کر لیتا ہے اور وہ ساری زندگی جنوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔''

''ناچتے ہوں گے بھئی۔'' میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تمہارے اشاروں پر ناچتا ہوں.........''

''میں نے سلطانہ کی بات پر یقین نہیں کیا۔ مگر اس نئے محلّے میں مجھے سکون نہیں حاصل تھا۔ بابے کی حرکتیں واقعی عجیب تھیں۔ دن کے وقت لوگوں کے درمیان بے تحاشہ گپیں ہانکتا بات بات پر قہقہے لگاتا اور اتنی دیر تک ہنستا رہتا کہ قریب بیٹھے ہوئے لوگ اسے گھور گھور دیکھنے لگتے۔ چائے خانوں میں اجنبیوں کے کپڑوں سے تھلی باندھ دیتا، جس کے آخری سرے میں کوئی چھوٹا سا پتھر یا آم کی گٹھلی ہوتی۔ چائے پی کر یا ناشتہ کر کے وہ آدمی جب باہر نکلنے کے لئے اٹھتا تو لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔ وہ اجنبی گھبرا کر قمیض کے دامن سے بندھی اس تھلی کو کھولنے کی کوشش کرتا کبھی ہنستے لوگوں کو شرمندہ نگاہوں سے دیکھتا۔ وہیں کہیں کونے میں بیٹھا ہوا بابے لپک کر سامنے آ جاتا اور کمال ہمدردی سے تھلی کھولنے میں اس کی مدد کرتا۔ ہنسی کو ضبط کئے بڑی سنجیدگی سے اس حرکت کے مرتکب کو گالیاں دیتا۔ ''جانے دیجیے حضت کسی حرام زادے کی حرکت ہے۔ کمینے کو یہ بھی پتہ نہیں کہ شریف آدمی کی خواہ مخواہ تھڑی اُڑانا کتنا بڑا گناہ ہے۔ معاف کر دیجئے حضت، وہ ذلیل شخص نار جہنم میں جلے گا.........'' پھر اس آدمی کو بابے بڑے خلوص سے ہوٹل سے رخصت کرتا۔ پھر جیسے ہی وہ شخص ہوٹل سے باہر نکلتا اتنے زور زور سے چیخ چیخ کر ہنستا، تالیاں بجا بجا کر اور چائے خانے کے فرش پر انگلیوں کے بل تقریباً رقص سا کرتا ہوا ہنستا کہ چائے خانے میں بیٹھے ہوئے وہ لوگ جو خود پہلے اس دل لگی پر ہنس رہے ہوتے، بابے کی ہنسی سے بھونچکا سے ہو کر خاموش ہو جاتے۔

ایک دن جب میں نے چائے خانے والے جمن کو بتایا کہ اس طرح تو ایک نہ ایک دن تمہیں اپنی دکان بڑھانی پڑے گی۔ تو اس نے بڑے بجھے ہوئے لہجے میں کہا کہ صاحب کیا کروں، مجبور ہوں۔ یہاں اس محلّے میں بابے کو ماننے والے بہت ہیں۔ لوگ انہیں مجذوب اور اللہ والے سمجھتے ہیں۔ میں کچھ کہوں تو یہ لوگ مجھ سے خفا ہو جائیں گے۔'' تب تو اس محلّے میں چائے خانہ چل چکا——'' ذرا دیر بعد اس نے پیر کے انگوٹھے سے کچے فرش کو کریدتے ہوئے کہا۔ '' پھر

صاحب میں بھی ڈرتا ہوں۔ واللہ عالم یہ سچ ہو ——— بابے کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہوں!'' پھر گردن کو جھٹک کر قدرے جوشیلے لفظوں میں کہا ——— ''تاہم اپنی دکانداری تو صاحب روز افزوں ہے۔ بکری بڑھتی ہی جاتی ہے.....''

مگر ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ کے باعث میں نے پہلی بار نفرت کے اُبلتے ہوئے سوتے کو خشک پایا۔ اور بابے کے لئے اپنے دل میں نرماہٹ محسوس کی۔

سنیما کے نائٹ شو سے واپسی کے بعد رات گئے جب میں اپنے احاطے میں داخل ہونے کو مُڑا تو رات کی گہری اور پُراسرار خاموشی میں کسی کی سسکیوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے چاروں اور دیکھا مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ ایسی خاموش رات گویا خود آج رات بھی سو رہی ہو۔ مگر سامنے والے پختہ مکان کے دروازے پر میری نگاہیں اٹک گئیں۔ اور سماعت نے گھٹنے ٹیک دیئے۔

میں بابے کی سسکیوں پر دھیان دیئے مبہوت سا کھڑا تھا۔ بار بار میرے کانوں میں فجو کا نام آیا۔ کراہتا کراہتا بابے بڑی گھٹی ہوئی آواز میں فجو کے نام کا ورد کر رہا تھا۔

اس وقت مجھے سلطانہ کی دہرائی ہوئی نیم الف لیلوی داستان میں کچھ سچائی نظر آئی کہ کم از کم ایک نام کی تصدیق ہو رہی تھی۔

دوسرے روز شام کو جب میں ابرار کے گھر سے چائے پی کر اس کے ہمراہ واپس ہو رہا تھا۔ میں نے فجو کے بارے میں اس سے پوچھا۔ چلتے چلتے ابرار نے ایک لمحہ کے لئے رک کر میری طرف دیکھا پھر تعجب سے کہا۔ ''تم کیسے جانتے ہو فجو کو؟''

''کل رات کے تقریباً دو بجے جب میں سو رہا تھا کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ اتنی رات کو اس تمہارے بھوتوں والے محلّوں میں کسی کی آواز سن کر بھئی میں تو سہم گیا۔ اس لئے میں نے اس کا نام پوچھا۔ جواب میں باہر والے نے کہا۔ ''میں فجو ہوں یار ———''

ابرار زور سے ہنسا اور جتنے زور سے اس نے قہقہہ لگایا اتنی شدت سے میری پیٹھ پر ایک دھول رسید کی۔ ''بیٹے اب مجھ سے مذاق کرتے ہو۔!''

''سچ یار، رات میں نے جب بابے کے کمرے سے سسکیوں اور کراہوں کے درمیان فجو فجو کی آواز سنی اور جب میں بستر پر گیا تو بڑے عجیب خوابوں کی وادی میں نکل گیا۔ اسی عالم میں مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے کمرے پر دستک دے رہا ہو۔ میں نے نام پوچھا تو مجھے لگا کہ

باہر سے فجو کا نام لیا گیا ہے۔ ''یار یہ فجو کون تھا؟''

چند ثانیوں کے لئے ابرار سناٹے میں آ گیا۔ چلتے چلتے رک کر اس نے انگلی والے چونے کو زبان سے اندر کھینچ کر دانتوں اور جبڑوں کی مدد سے پان کے ساتھ ملا لیا۔ پھر ایک بڑی سی پیک نالی کی طرف پھینکتے ہوئے تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ آج ہی مکان چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤں۔ ''چلو تمہارے لئے کوئی مکان ڈھونڈتے ہیں شام تک۔ اور اگر آج مکان پانے میں ہم ناکام رہیں تو پھر میاں بیوی چپکے سے میرے یہاں چلے آؤ۔ تاوقتیکہ تمہیں.....''

میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر ابرار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''فجو کون ہے؟''

اس نے میرے لہجے سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''ارے یار تم خواہ مخواہ سیریس ہوتے ہو۔ وہی تو کہہ رہا ہوں کہ فجو کوئی ہے نہیں، تھا۔ اسے مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ اور تم کہہ رہے ہو کہ راتوں کو اس کی روح تمہارے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں بیٹے جان ہے تو جہان ہے۔ اس لئے وہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم نے بابے کو گالیاں دی تھیں نا۔ اسے مارنے کو دوڑے تھے۔ سب اسی کا انتقام ہے۔''

میں ابرار کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر رہا تو بے اختیار چیخ پڑا۔ ''سالے تم بک کیا رہے ہو؟''

''ارے یار سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس نے اپنے گریبان سے میرے ہاتھوں کو الگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''فجو بابے کا لڑکا تھا جو عین شادی کے تین دن پہلے محلّے کے تالاب میں ڈوب کر مر گیا.....۔''

''کیسے؟'' تعجب اور اشتیاق کی ملی جلی کیفیت میں ڈوبا ہوا یہ لفظ میری زبان سے نکلا۔ جیسے ایک صبح کو ایک گوری ناری لڑکی کے ہاتھ سے پھولوں کی تھالی گر پڑی تھی۔

''پتہ نہیں، ان دنوں میں اس شہر میں آیا ہی نہیں تھا.....'' کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد اس نے ایک بار زور سے ہنکارا'' پھر بولا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اسے ایک لڑکی سے محبت تھی۔ اور لڑکی اس کے باپ یعنی بابے سے راتوں کو ملا کرتی تھی۔ حمید قصائی کہتا ہے کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے بابے کو رات کے وقت گلی کے نکڑ پر سکینہ کے

سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حمید نے ایک بار جب میں اس کے یہاں بیٹھا گوشت کی بوٹیاں کٹوا رہا تھا۔ رازدارانہ انداز میں بتایا کہ لڑکے نے خودکشی نہیں کی۔ واللہ اعلم بالصواب، خدا جھوٹے کو کفن نصیب نہ کرے۔ وہ للو مونگ پھلی والا کہتا ہے کہ اس دن وہ بھی تالاب گیا تھا۔ ان باپ بیٹے کے ساتھ۔ اس نے مجھے بتایا کہ خود بابے نے فجو کو پتھر پر سے دھکا دے کر نیچے دھکیل دیا تھا.....

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔؟" میرے تخیل کے سبک خرام پاؤں نے ایسی ٹھوکر کھائی کہ میں لڑکھڑا کر ایک گہری کھائی میں گرتے گرتے بچا۔ سچائیاں بھیانک ضرور ہوتی ہیں مگر اتنی بھیانک چیز سچائی میں کیسے تبدیل ہوسکتی ہے۔ میرے تجسس کو گویا ایک اور ہوا لگی۔

"میری بات پر یقین نہیں آتا نا، یار تم خود مونگ پھلی والے للو سے پوچھ لو۔"

للو مونگ پھلی والے نے کان پر ہاتھ رکھا اور چرس کے نشے سے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "باؤجی، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ پہلی بار جس دن جھوٹ بولا۔ یوں سائیکل سے گرا کہ آج تک کے لئے لنگ مارتا ہوں۔" للو مونگ پھلی والے نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو میرے قریب کردیا۔ دوسری بار جھوٹ بولا باؤجی، اس دن میں نے چرس کو ہاتھ لگایا۔ سو آپ دیکھ رہے ہیں ان دنوں سانس کم لیتا ہوں اور کش زیادہ لگاتا ہوں۔ اس لئے باؤجی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس دن تالاب میں میں بھی تھا۔ مگر بابے نے فجو کو دھکا نہیں دیا۔ بلکہ فجو ہی نے بابے کو .....

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے چونک کر للو سے کہا۔ "مگر یہ بھی کیسے ہوسکتا ہے؟"

میں نے للو کے سامنے پڑے ہوئے مونگ پھلی کی چھوٹی سی پہاڑی پر اوپر سے نیچے تک ہاتھ پھیرا۔ پھر ایک مونگ پھلی کو دو انگلیوں کی مدد سے پھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ میرا مطلب ہے ایسا بھی کیونکر ممکن ہے کیسے ہوسکتا ہے؟"

للو نے میرے ہاتھ سے مونگ پھلی لے کر سامنے والی پہاڑی پر نکاتے ہوئے کہا۔ "ہو کیسے نہیں سکتا باؤجی! ایسا ایک دم میرے سامنے ہی ہوا ہے۔ چشم دید حالات کہہ رہا ہوں۔ کوئی قصہ کہانی نہیں۔ اس دن بہ ظاہر باپ بیٹے خلاف دستور بہت خوش تھے....."

"خلاف دستور کیوں؟" میں نے بات کاٹی۔ "پہلے کیا لڑائی رہتی تھی دونوں میں؟"

''ہاں جی، بہت سخت۔'' پھر اس نے میری طرف جھک کر آہستگی سے کہا ''فجو ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا نا، باؤ جی ——— اس لئے بابے اس سے بہت ناراض رہتا، کہتا، تو جہاں بول میں تیری شادی کر دوں۔ جس سے بول کر دوں، لیکن سکینہ سے تیری شادی ہو ہی نہیں سکتی..... مگر لڑکا بھی ایک ضدی تھا باؤ جی اس نے بھی کہا۔ میں شادی سکینہ سے کروں گا۔ اور باپ کو للکار کر دیکھ لینا تمہارے سامنے ہی کروں گا۔ باؤ جی، ذرا کش لگالوں۔ تم بیٹھے ہو تو سانس بھی لینے لگا ہوں ذرا دیر بعد جب للو مونگ پھلی والا چلم کو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے دبا کر زور سے کش لے چکا تو اس کی سرخ سرخ آنکھیں قدرے باہر نکل آئیں۔ اس نے میری طرف مخمور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا باؤ جی؟''

''تم کہہ رہے تھے فجو سکینہ سے شادی کرنے کے لئے بہ ضد تھا۔''

بہ ضد کیا تھا باؤ جی، وہ تو ایک دم سے پاگل ہو گیا تھا۔ پاگل ——— جب ہی تو باپ کو دھکا دے دیا تالاب کی طرف..... ذرا ٹھہر کر اس نے پھر چلم کا کش لیا، اور کہا، بات دراصل یہ تھی باؤ جی کہ لڑکا بہت چالاک تھا۔ اس نے اسی دن صبح کو جھوٹ موٹ کہا کہ آپ جب کہہ رہے ہیں تو میں سکینہ سے شادی کرنے کا خیال چھوڑ دیتا ہوں۔ چنانچہ دونوں میں میل ملاپ ہو گیا۔ دوسرے دن بابے نے اس کی شادی طے کی۔ تین دن بعد بارات جانے والی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر کی جلی ہوئی دنیا جب شام پڑے ذرا ٹھنڈی ہوئی تو میں نہانے کی غرض سے تالاب کی سمت نکل گیا۔ دیکھا تو باپ بیٹے دونوں خوش خوش نہا رہے ہیں۔ اب تو یہ تالاب سوکھ گیا ہے باؤ جی۔ مگر چار برس پہلے تو گرمی کے موسم میں بھی جل تھل رہتا تھا، تو بابے ایک چٹان پر پاؤں کو پانی میں دیئے بیٹھا تھا اور فجو چلو سے پانی لے لے کر باپ کی پیٹھ دھو رہا تھا کہ باؤ جی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ فجو نے زور سے بابے کو دھکا دیا تالاب کنارے سے درمیان تک بڑے سخت قسم کے ڈھلان والا تھا۔ اور اندر چکنی مٹی بھی تھی۔ بابے فجو کے جھٹکے سے نیچے جانے لگا تو شاید اس نے اپنے پاؤں کی انگلیوں کو مٹی میں گاڑنے کی کوشش کی۔ لیکن باؤ جی مٹی بہت چکنی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ باہر کھڑا لونڈا اسے دیکھ رہا تھا۔ جس نے اسے چند سکنڈ پہلے خود اپنے ہاتھوں سے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ میں مبہوت کھڑا باؤ جی گویا پتھر ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی زندہ آدمی کو یوں ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کس شدت سے وہ

گھگھیا رہا تھا کہ اچانک پتہ نہیں کہاں سے لونڈے کے دل میں محبت جاگی اور اس نے آن واحد میں تڑپ تڑپ کر پانی میں چھلانگ لگا کر بابے کو کمر سے پکڑ لیا اور لگا، زور لگا لگا کر اسے اپنی طرف کھینچنے، مگر میں نے کہا نا باؤجی تالاب کی مٹی چکنی تھی وہ خود پھسلنے لگا۔ اس سمئے فجو کا ایمان جاگا تھا۔ اور باؤجی جب ایمان جاگتا ہے تو آدمی کسی شے کی پروا نہیں کرتا۔ چنانچہ فجو جان کی پروا نہ کرتے ہوئے تالاب میں خود باپ سے آگے بڑھ گیا۔ اور مجھے آواز دی کہ میں آگے سے بابے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچوں۔ میں نے مٹی میں ایک محفوظ جگہ پر پاؤں جمائے اور بابے کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ پھر جو خود تالاب میں آگے بڑھ کر کسی طرح بابے کو دھکا دینے لگا۔ اور میں اسے کھینچنے لگا۔ اس وقت کا عالم بڑا عجیب تھا باؤجی۔ فجو کی محبت اور جانفشانی دیکھنے کی چیز تھی۔ وہ اچھل اچھل کر بابے کو دھکا دیتا اور اپنی جگہ سے دو چار انچ پیچھے چلا جاتا۔ یہ عمل منٹوں جاری رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ فجو کے دھکے میں وہ زور نہیں رہا اور اس کی سانس اکھڑنے لگی.....''

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی زرنگار کرنیں جب محلے کی خلط ملط مکانوں کی منڈیروں کو چومتے ہوئے مغرب کی سمت جھکنے لگیں۔ اور ذرا دیر بعد آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں تو خلاف دستور یکا یک فضا پر ایک گہری اداس افسردہ سی کیفیت مسلط ہو گئی۔ اس وقت میں للو مونگ پھلی والے کے پاس سے اٹھا تو میرا دل گہرے کائی آلود تالاب میں کسی بابے کی طرح ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جسے کوئی فجو بچانے کے لئے نہیں بڑھ رہا تھا۔ سامنے پیپل کے بوڑھے موٹے لمبے لمبے ریشوں والے پیڑ سے لاتعداد چڑیوں کی چہکار نے سناٹے کو اور بھی بھیانک کر دیا تھا۔ افسردگی کے شدید احساس کے گراں بوجھ تلے دبا، میں گھر کی طرف آ رہا تھا کہ میری نظر بابے کے زرد مکان کی طرف اٹھ گئی۔

شام کے سرمئی دھندلکے میں بابے کے بند دروازے سے لگا کوئی ہولے ہولے منہ ہی منہ میں بدبدا رہا تھا۔ میں نے اپنے احاطے میں داخل ہونے سے پہلے پلٹ کر ادھر دیکھا۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں!'' کوئی نسوانی آواز میری سماعت کو لرزا کر آگے نکل گئی۔ اور ایک سایہ تیزی سے سڑک پر آ گیا۔ پتہ نہیں کیسے میں غیر ارادی طور پر لپک کر سڑک پر پہنچ گیا۔ اور اس عورت کی کلائی پکڑ لی۔

''تم کون ہو؟'' اور کیوں چوروں کی طرح بابے کی.....؟''

''مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے چھوڑ دیجئے۔'' خوف سے لرزیدہ لڑکی رونے لگی۔

''نہیں، پہلے تم اپنا نام بتاؤ؟''

پہلے تو کچھ دیر تک وہ لڑکی اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے میری گرفت میں جکڑی اپنی کلائی کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر جب اس طرف قطعی مایوس ہوگئی تو وہ آہستہ سے نرم لہجے میں بولی۔ ''سکینہ۔''

دفعتاً میری گرفت آپ ہی آپ ڈھیلی پڑ گئی اور چند ثانیوں کے بعد سکینہ کی کلائی آزاد تھی۔ سکینہ نے اپنی کلائی پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ سر سے ڈھلک آنے والے آنچل کو درست کیا۔ اور ایک نظر مجھے دیکھ کر بڑی طمانیت سے آگے بڑھنے لگی۔

''تم وہی سکینہ ہو نا ——'' میں ذرا آگے بڑھ گیا۔

''نہیں ——'' سکینہ نے پلٹ کر دھندلکے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ سکینہ تو کبھی کی مر گئی ——''

''پتہ نہیں اس محلے میں کتنی سکینائیں رہتی ہیں۔ میں نے ایک ایسی سکینہ کے بارے میں سن رکھا ہے جو اس محلے میں بیک وقت باپ بیٹے دونوں سے عشق کیا کرتی تھی۔'

''جواب میں سکینہ بڑے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔'' توبہ خدا سے ڈریئے۔ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں.....!

''بابے کا فجو تالاب میں گر کر مر گیا۔ شاید بابے نے خود ہی فجو کو دھکا دے دیا مگر لوگ تمہارا نام لیتے ہیں؟''

سکینہ نے دفعتاً چہرہ اٹھا کر میری طرف یوں دیکھا جیسے میرا وجود زہریلے سانپ کا پھن ہو۔ مگر میرے چہرے پر پتہ نہیں اسے کیا چیز ملی کہ اس کی آنکھیں معاً بھر آئیں۔ ذرا توقف کے بعد اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''پتہ نہیں فجو نے خودکشی کی یا..... مگر ذمہ دار واقعی میں ہی ہوں۔ فجو کی موت یا میری تباہی میری اماں اور فجو کے ابا کے مشترکہ گناہوں کا خمیازہ تھا۔ ایک سزا تھی۔ جو اولادیں جھیل گئیں.....''

سکینہ ذرا دیر خاموش رہی۔ اس نے اپنی نیچی نگاہیں اٹھا کر ایک بار پھر میری طرف یوں

دیکھا۔ گویا اس نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز، سب سے گہرے درد سے مجھے آگاہ کر کے متوقع ہو کہ میں اس درد کو پی جاؤں اور اس راز کو اپنے دل کے نہاں خانے میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دوں۔

میں نے آہستہ سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ''ایسا ہی ہوگا..... مگر یہ بات تمہیں معلوم.....؟''

اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت بعد میں جب پانی سر سے گزر چکا تھا.....''

میں نے ابرار کو بتایا کہ میں جو محلّے کے لئے اجنبی سمجھا جاتا ہوں تو یار میں یہاں کا بہت سیانا باشندہ ہوں۔ کیونکہ اس محلے کے سب سے الجھے ہوئے انسان کی مملکت کے کھونٹ کھونٹ کی میں نے سیر کی ہے۔ اور محلے کے ڈھیروں گرد و غبار میں سسکتے ہوئے درد کے زہر کو کسی بھولے شنکر کی طرح اپنی روح میں اتارا ہے۔ اور تم لوگ جس بہ ظاہر ہرے بھرے تنے کو دیکھ کر استعجاب کی دنیا میں کھو جاتے ہو۔ وہ تنا در حقیقت اندر ہی اندر اس درجہ کھوکھلا ہے کہ اس میں گندی چمگادڑوں نے گھونسلہ بنا لیا ہے۔ اور دن بھر اور رات گئے تک اس میں بدروحوں کی طرح بھٹکتی پھرتی ہیں۔

جاڑے کی سرد راتوں میں جب کہ ساری دنیا نیند کی گہری آغوش میں سو رہی ہوتی ہے۔ میں نے تھرتھراتی ہوئی تنہا چاندنی میں بابے کو کسی آسیب زدہ روح کی طرح بھٹکتے ہوئے دیکھا ہے۔ بے چینی سے اپنی مٹھیوں کو کھولتا، بند کرتا، وہ تیزی سے تھپ تھپ کرتا گلی میں یوں لپکتا ہوا گزر جاتا۔ گویا نکڑ پر کوئی اس کا انتظار کر رہا ہو۔ دودھیا ویران چاندنی میں خمیدہ پشت کے باعث زمین پر اس کا سایہ اس قدر ہیبت ناک معلوم ہوتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے میں خوف محسوس کرنے لگتا ہوں۔ بڈھا بابے جب دھپ دھپ کرتا تیزی سے گلی کے نکڑ تک پہنچ چکتا ہے تو آگے نگاہ اٹھا کر دیکھے بغیر اسی تیزی سے واپس ہوتا ہے۔ اور اسی عجلت و بیقراری کے عالم میں گلی کے اس کونے میں پہنچ کر پرانے درخت کے نیچے یوں آ کھڑا ہوتا کہ جیسے یہ صدیوں کے لئے یہیں استادہ رہ جائے گا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ساری رات یوں ہی بے قراری میں ٹہل ٹہل کر گزار دیتا——!

لیکن بعض اوقات بابے سر شام ہی سے اپنے گندے نیم تاریک کمرے میں مقفل کھری چارپائی پر کروٹیں لیتا رہتا۔ آدھی رات کے گہرے سناٹے میں بابے کے تاریک کمرے

سے سسکیوں کی آواز سنائی دیتی۔ کبھی ہولے ہولے باتیں کرنے کی بھنبھناہٹیں سنائی دیتیں۔ یوں بھی ہوتا کہ بابے اپنے کمرے میں چپکے چپکے یوں کراہتا جیسے کوئی بھاری پتھر اس کے سینے پر رکھ دیا گیا ہو۔ جس کے نیچے بابے کی بے تاب کراہیں دم توڑ رہی ہوں۔ کئی رات جاگ کر میں نے بابے کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا۔ اور کئی بار جب اس عجیب وغریب ہستی کی حرکتوں کا بہ غور مطالعہ کر کے گھر لوٹا ہوں اور گہری نیند سوئی ہوئی سلطانہ پر ایک نظر ڈال کر بتی گل کر دی ہے تو ایک کُبڑا سا دراز قد انسان کا خلط ملط سایہ میرے ذہن کے اُفق پر رات رات بھر یوں جھولتا ہوا محسوس ہوا ہے گویا کوئی پھانسی پر جھول رہا ہو۔

مگر میں نے دن کے اجالے میں اسی بابے کو یوں پرشور قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا ہے کہ جس کی آواز سے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر پرواز کرنے لگتے ہیں۔ اسے بچوں کی طرح مطمئن اور خوشیاں مناتے ہوئے پایا ہے۔ اور کسی صاحب اعجاز ہستی کی تمکنت سے لوگوں کا ٹھٹھول کرتے دیکھا ہے۔ پتنگ اُڑانے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کے دھاگے توڑ کر ان کی پتنگوں کو لاجوردی آسمان میں بھٹکتے ہوئے دیکھ کر بابے یوں بچوں کی طرح زور زور سے تالیاں بجا بجا کر خوش ہوتا ہے۔ جیسے زندگی کی ساری خوشیاں سمٹ کر اس کے چھوٹے سے دل میں جاگزیں ہوگئی ہیں۔ میں نے بابے کو بدتمیزیاں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ راہگیروں پر کنکریاں پھینک کر انہی سے ہمدردی کرنے لگتا ہے۔ وہ پردے والی بیبیوں کو چھیڑنے سے گریز نہیں کرتا۔ وہ برقع کے اندر جوان یا بوڑھی عورت کو اس کی اور اپنی عمر سے بے پروا ہو کر مذاق کرتے ہوئے نہیں جھجکتا ایک دن اس نے برقع پوش خاتون کو چھیڑا.....!

دفتر سے واپسی پر میں رمضان پان والے سے سگریٹ خرید رہا تھا ـــــ ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا تھا۔ اور سورج کی کمان سے اتری ہوئی کرنیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں کہ ویران سنسان راستے میں ایک سیاہ برقع پوش خاتون نظر آئی برقع سیاہ تھا اور اس کے اندر ملبوس عورت کی جلد گندمی رنگ کی قدرے صاف تھی برقع گردن کے پاس پھٹا ہوا تھا۔ جس میں سے گردن کی سفید جلد سورج کی کرنوں سے مزید وضاحت سے چمک رہی تھی۔ قریب پہنچ کر بابے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیگم صاحبہ، ذرا گردن کے چاند کو تو ڈھک لو۔ ابھی اندھیرا ہوا نہیں کہ ابھی سے

چاندنی چھٹکنے لگی.....''

برقع پوش خاتون دفعتاً چونکی، شاید اسے اچانک یاد آ گیا ہو کہ گردن کے پاس برقع پھٹا ہوا ہے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے گردن کی جلد پر ہاتھ رکھ دیا۔ بابے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر لڑکی نے چاہا کہ لپک کر آگے بڑھ جائے مگر یکبارگی بابے نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا۔ اتنا طویل قہقہہ کہ میں نے محسوس کیا گویا بابے کا وجود، ایک لمبا، بے حد طویل قہقہہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہو۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ برقع پوش خاتون بھی سہم گئی۔ اس کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ اُس نے پلٹ کر بابے کی طرف دیکھا جو بے تحاشہ ہنسے جا رہا تھا۔ ذرا دیر بعد جب بابے کا قہقہہ ہلکا پڑا تو اُس نے آہستہ سے نقاب اُلٹ دی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس نے عجیب نظروں سے بابے کو دیکھا اور ہلکتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں تمہاری سکینہ!''

اب میں کسی سر پھرے دوست کو کس طرح یقین دلاؤں کہ گلیاروں میں مارے مارے پھرنے والے زخمی دل انسان کسی مملکت کے شہنشاہ ہونے کی بجائے بے طرح لٹے ہوئے قمار باز ہوتے ہیں جو دن کے اجالے میں اگر اپنی بے ہنگم اور دوکوڑی کی بے بضاعت ہنسی کو بازی پر لگاتے ہیں۔ تو رات کی تنہائی میں ٹوٹی پھوٹی کراہوں اور آنسوؤں کے نقلی موتیوں کو سمیٹ کر بساط پر آ بیٹھتے ہیں۔ اور دونوں کو لٹا کر جب وہ کلبۂ احزاں کی طرف پلٹتے ہیں۔ تو اس کی پیاری روح کالی چڑیلوں کی طرح چیختی چلاتی ہے۔

سکینہ نے نقاب ڈال لی۔ اور بھاری قدموں سے آہستہ آہستہ وہاں سے چل پڑی۔ آس پاس دو چار راہ گیر جمع ہو گئے تھے۔ بابے، لوگوں بلکہ مافیہا سے بے نیاز، اپنے آپ میں گم بڑی بے قراری سے سڑک کی دوسری سمت ہو لیا۔ میں نے دیکھا، آگے چل کر اس کے قدم سست پڑ گئے ہیں۔ مجھے اس لٹے ہوئے جواری پر بے طرح ترس آنے لگا۔ سنسان سڑک پر وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ تیز تیز قدم بڑھا کر میں نے اسے جا لیا۔

بابے نے اپنے پیار کے بھوکے کندھے پر میرے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تو اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ اس نے پلٹ کر آہستگی سے میری طرف دیکھا۔ اس کے سست قدم اور بھی سست پڑ گئے۔

"کیا کروں بابو، بڑا سناٹا معلوم پڑتا ہے۔ بڑی بھیا نک چپ ......" اس نے آپ ہی آپ کہنا شروع کیا۔ "یہ بھری پڑی دنیا، ایسی خاموش، ایسی سنسنان جان پڑتی ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے۔ سوچتا ہوں، بولوں نہیں، ہنسو نہیں تو ——— کہیں یہ سناٹا مجھے نگل نہ لے ......!!"

عین اس وقت ایک پتنگ غوطہ کھا کر ہمارے سروں پر سے پھڑ پھڑاتی ہوئی اُٹھ گئی۔ ہم نے یکبارگی سر اُٹھا کر دیکھا تو سرسراتی ہوئی پتنگ سفید بادلوں سے اَٹے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں بہت دور ایک سیاہ دھبے کی طرح تھر تھرا رہی تھی ....

اور دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے کوئی شخص میرے ذہن کے اُفق پر برسوں سے جھول رہا ہے اور شاید برسوں جھولتا رہے گا۔

OO

ڈورتھی جون سین

پورا نام کیا لکھوں ـــــ ڈورتھی لامار؟"

دُبلے پتلے بنگالی جیولر کی آنکھیں عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے طنز سے مسکرائیں۔ اور وہ انگلو انڈین لڑکی جو اپنے سونے کا ہار جیولر کو دے چکنے کے بعد سوچ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور جس کے بال ریشمی نہیں تھے، اور جس کے فراک کے اُڑے اُڑے ہوئے رنگ نے بنگالی جیولر کو اس قدر گہرا طنز کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ چونک اٹھی، جیسے کسی نے اسے ایک موٹی گالی جڑ دی ہو، ہوا میں اُڑتے ہوئے بھورے بالوں کی لٹ کو پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ـــــ ڈورتھی جون سین! ـــــ لامار ہوتی تو ہندوستان کے ایک معمولی سے شہر کی ذلیل سی دکان میں اپنا زیور بیچنے نہ آتی..... اور نہ ہی....."

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی۔ سفید کاغذ پر دوڑتی ہوئی فونٹین پن کی سنہری نب کو دیکھنے لگی۔ جو ننھے ننھے خوب صورت حروف بناتی ہوئی بڑی تیزی سے اپنے پیچھے سیاہ نقش چھوڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

"اس پر دستخط کر دیجئے میڈم ـــــ!" بنگالی جیولر نے کہا۔

تیزی سے دوڑتی ہوئی نب کب رکی اسے اس کا خیال بھی نہ رہا۔ اچانک بڑے سے سفید موٹے کھاتے کی تحریر پر اس نے ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر جلدی سے جیولر کی بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کر دیا۔ اور ایک سو دس روپے کے نوٹ سنبھالتی ہوئی وہ سائیکل کے اگلے چکّے کو دبا کر ہوا دیکھ ہی رہی تھی کہ پھر بنگالی جیولر کی آواز نے اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا۔

"اور روپے کی ضرورت آپڑے تو بے تکلف آجایئے گا میڈم! زیور نہ بھی ہو تو کوئی

حرج نہیں۔ صرف آپ کا ہونا کافی ہے!!''
اس کے جی میں آئی کہ تمام نوٹ چاک کر کے کمینے جیولر کے منہ پر دے مارے۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ دوسرے لمحے ہی اس کے تحت الشعور میں جون کھانستا ہوا بے بسی کی حالت میں نمودار ہوا.........اور وہ چپ چاپ گھر کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر ہولی۔

ڈورتھی جانتی تھی کہ جیولر صرف جیولر ہی نہیں بلکہ دلال بھی ہے۔ اور لڑکیوں کو پھانس کر وہ شہر کے کارخانہ داروں، مل مالکوں اور رئیس افیسروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس طرح کافی روپے وہ کما لیتا ہے۔ انگلو انڈین لڑکیوں کی تو وہ ٹوہ میں رہتا ہے جسے خریدار خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ اس طرح دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں اسے زیادہ دلالی مل جاتی ہے۔ اور اس نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسی جیولر کے پاس جانا مناسب سمجھا تھا۔ یہ جیولر شہر کے کچھ کنارے رہتا ہے۔ اس نے سوچا، زیور بیچتے ہوئے اسے کوئی جانا پہچانا ہوا آدمی دیکھ نہ پائے گا۔ اس نے سوچا تھا اگر اپنا آپ ٹھیک ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیولر کو اتنی جرأت ہی نہ ہوگی کہ وہ کسی شریف خاتون کو آوارگی کی دعوت دے سکے۔ وہ عورتیں تو آپ ہی جیولر کے پاس اس غرض سے آتی ہیں جو کمینی ہیں۔ جنہیں گناہ نے کچھ اس قدر ملوث کر دیا ہے کہ وہ چند روپے یا ایک لمحاتی عیش کے لئے اپنی عصمت تک بیچ ڈالتی ہیں۔ اور یوں وہ اپنی ذلت کا سامان آپ پیدا کرتی ہیں۔ انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کو تباہ کر دیتی ہیں۔ وہ تو شریف ہے۔ جیولر کو کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔

لیکن بنگالی جیولر اپنی کمینگی سے باز نہ آیا۔ اس نے ڈورتھی کو بھی گناہ کی دعوت دیتے ہوئے جھجک محسوس نہ کی۔ اور آج وہ بنگالی جیولر کی اچھالی ہوئی کیچڑ کو اپنے دامن پر صاف دیکھ رہی تھی۔ ڈورتھی سوچتے سوچتے پھر اپنے خیالوں کی گہرائیوں میں ڈوب سی گئی۔ سائیکل دو رویہ درختوں اور مکانوں کے بیچوں بیچ گذرنے والی اکیلی اور بیوہ کی چھاتی کی طرح ویران رہنے والی سڑک پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ سیاہی مائل سبز درختوں کی قطار پیچھے کھسکتی جا رہی تھی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے ڈورتھی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سڑک کا بایاں موڑ قریب تھا۔ جہاں سے اسے اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک ملتی تھی۔ سرخ اینٹوں والا گرجا اس کے سامنے تھا۔ گرجا کی عین پیشانی پر کندہ تھا——''یسوع نے کہا اُٹھ——اور لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی!'' ڈورتھی نے سوچا، کاش اسے

کہیں خداوند یسوع مل جاتا۔ اس وقت وہ اپنا سر پورے خلوص سے اس کے قدموں پر ڈال کر کہتی۔ ''اے مردہ لڑکی کو زندہ کرنے والے مقدّس خدا! تجھ سے ایک بے بس اور لاچار لڑکی دعا کر رہی ہے۔ کہ تجھے تیری ماں ورجن میری کی عصمت کی قسم کہ میری عصمت کی موت سے پہلے خود مجھے موت آجائے۔ مجھے اس جہاں سے اُٹھا لے۔ اپنے پاس، عرش کی بلندی پر، جہاں پہنچ کر کوئی بنگالی جیولر مجھ پر کیچڑ نہ اُچھال سکے............!!''

گرجا فرلانگ بھر پیچھے رہ گیا۔ اس کی سائیکل اکیلی سڑک پر مونگ دلتی چلی جارہی تھی اور ڈورتھی کو یسوع کہیں نہ مل سکا۔ جب وہ اپنے کمرے کے قریب آئی تو اندر سے جون کے کھانسنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ جلدی سے سائیکل کو دروازے والے زینے سے لگا کر اندر لپکی۔ لیکن اتنی دیر میں جون کی کھانسی بند ہو چکی تھی۔ اور وہ تکئے کے سہارے نیم دراز کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ تولئے سے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کئے جارہا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کر لینے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گیا ہو۔ ڈورتھی نے خلاف توقع جون کا چہرہ اترا ہوا دیکھا جون کے کانوں میں جب ڈورتھی کے قدموں کی چاپ گئی تو اس نے گردن گھمائی۔

''آ گئی ڈارلنگ! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔!''

''کیوں؟ کیسی طبیعت ہے تمہاری؟؟' ڈورتھی سامنے والے اسٹول کو پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اور جون کے ہاتھ سے تولیہ لے کر اس کے پسینے کو خود پونچھنے لگی۔

''کچھ نہیں ڈورتھی، آج ذرا کھانسی آ گئی ہے............شاید خون بھی آیا ہے!''

''خون ——؟'' ڈورتھی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں کسی نے تیز اور زہر میں بھیگا ہوا نشتر چبھا دیا ہو۔ تین مہینے کے بعد آج پھر خون آ گیا تھا ڈورتھی نے دیکھا، جیسے، وہ ڈوب رہی تھی۔ سمندر کے بیچوں بیچ، طوفان کے یلغار میں، ڈوبنے سے بچنے کے لئے اس نے انتہائی کوشش کی، ہاتھ پیر مارے تڑپی، اچھلی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ جلد ہی ساحل سے جا لگے گی تو یکایک اسے پھر غیر مرئی ہاتھوں نے سمندر کے بیچوں بیچ پھینک دیا۔ پھر وہی طوفان، وہی تھپیڑے............وہ سوچ کی گہرائی میں ڈوبتی ہی چلی جارہی تھی —— پھر آپ ہی آپ چونکی، دیکھا تو جون ٹکٹکی لگائے اسے دیکھ رہا ہے۔ اداس، غم دیدہ، جیسے ڈورتھی کے دکھوں کے ایک

ایک لمحہ ایک ایک پل سے واقف ہو۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں سلگتی ہوئی آگ میں اس کے ساتھ خود بھی جل رہا ہو۔ ڈور تھی جس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور جو بھول گئی تھی کہ ڈاکٹر نے جون کے سامنے مغموم رہنے کی سخت ممانعت کی ہے۔ اپنے آنکھوں میں آئے ہوئے دل کے خون کو چہرہ پھیر کر خشک کیا کہ جون دیکھ نہ پائے۔

''میرے جانے کے بعد کہیں تم گئے تھے۔؟''

''ہاں، ذرا سامنے سڑک تک۔ اکیلے گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ سوچا ذرا ٹہل لوں۔ جی بحال ہو جائے گا۔ آتے آتے بہت تھک گیا تھا۔ ڈارلنگ!''

ڈور تھی جانتی تھی کہ ڈاکٹروں نے جب اسے بستر سے اُٹھنے تک کو نہیں کہا ہے۔ جون اتنا چلا تو پھر خون آ ہی گیا ہوگا۔ وہ جون کو ایک منٹ بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی کہ وہ اٹھنا چاہے تو اکیلے میں کیسے اُٹھ سکے گا؟ آج اس کی محنتوں پر پانی پھر گیا۔ جو ڈر لگا ہوا تھا وہی ہوا۔ کاش وہ آج اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جاتی۔ یا جانے سے پہلے اسے ہر طرح کی تاکید کر دی ہوتی۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ باہر نکل پڑے اور آنکھوں میں بہہ آنے والے سیلاب کو چھوڑ دے۔ تاکہ اس طرح اس کے دل کا سارا غبار، سارا درد ڈھل جائے۔ لیکن وہ جون کو چھوڑ کر نہ جا سکی اور سیلاب کو ضبط کر لیا۔ اس نے سوچا کہ وہ جون سے پہلے..... خود نہیں مر سکتی.....؟ انسان کتنا مجبور ہے۔ وہ سوچتی رہی..... سوچتی رہی..... اور آفتاب دور گھنے درختوں کے نیچے اتر گیا۔ دھیرے دھیرے فضا میں دھندلکا پھیلنے لگا اور اداس ماحول اور بھی اداس ہو گیا۔ ڈور تھی پلنگ پر بیٹھ کر جون کے سر کو اپنی گود میں لئے آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ اس کی نگاہیں دور آسمان پر پھولی ہوئی شفق پر لگی ہوئی تھیں جو دھندلکے میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

جون جو اپنا سر اس کی گود میں رکھ کر سو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اس کے سر کو اٹھا کر تکیے پر رکھ دیا۔ کمرے میں دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لٹے ہوئے انسان کی طرح بوجھل قدموں سے لیمپ تک گئی۔ اور لیمپ روشن کر دیا اس نے دیکھا میز پر بیکری والا لڑکا نہ جانے کب روٹی رکھ کر چلا گیا تھا۔ روٹی دیکھ کر جیسے سوئی ہوئی بھوک بیدار ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ صبح سے دو توش اور ایک چائے کی پیالی پر اب تک ہے۔ اس نے سوچا، اسے کچھ کھا لینا چاہیے۔ بھوک تو آدمی کو اور بھی نڈھال کر دیتی ہے۔

کھوں.....کھوں.....اوہ.....او.....''

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا شوہر کھانسی کے باعث نیند سے جاگ اُٹھا اور پھر کھانسی کا تسلسل کچھ اس طرح بندھ گیا کہ ڈورتھی ڈر گئی۔ مبادا اُسے کچھ ہو نہ جائے۔ جون کھانستا ہی جا رہا تھا اور ڈورتھی اسے بازوؤں کا سہارا دیئے اس کی پشت پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ نہایت گھبرائی ہوئی۔ پھر جون کی کھانسی دھیرے دھیرے تدریجی طور پر تھم گئی۔ اور وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح ڈورتھی کے بازوؤں میں جھول گیا۔ اور سر کو پلنگ سے نیچے کر کے تھوکتا رہا۔ ڈورتھی متوحش نگاہوں سے چراغ کی روشنی میں اس کے تھوک اور کھنکار کے ساتھ آئے ہوئے خون کی سرخی کو دیکھ رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ خود بے ہوش ہو جاتی کہ اس نے ضبط کیا۔ اپنے آپ کو سنبھالا ——

''دیکھو ڈورا خون تو نہیں ——؟''

ڈورتھی نے پلنگ سے جھانک کر ایک دفعہ دیکھا۔ اور کوشش کرنے کے باوجود وہ جھوٹ نہ بول سکی۔ وہ سچ بھی نہ بول سکی۔ خاموش رہی۔ دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو دبائے، آنکھوں سے بہہ آنے والے سیلاب کو تھامے —— کچھ لمحوں کے بعد جون نے خود ہی جھانک کر دیکھا۔ لیمپ کی مدقوق روشنی میں فرش پر جا بجا خون کے دھبے نظر آئے۔ ڈورتھی نے دیکھا کہ یہ دیکھ کر اچانک اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے اور پیشانی اور جسم پر پسینے بڑی تیزی سے بہنے لگے ہیں۔ وہ تولیہ لے کر جون کے پسینے کو خشک کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس وقت اسے ضبط کرنا ہے۔ وہ جون کو کیا سنبھالے گی۔ وہ خود نڈھال ہوتی جا رہی ہے۔ وہ خود برسوں کی مریض نظر آنے لگی ہے اور پھر جب اس کی اس کیفیت کی طرف جون کا خیال گیا تو متوحش نظروں سے دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا ڈورا؟ تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو ——؟؟''

اور اچانک ڈورتھی کو احساس ہوا کہ اس کا یوں پریشان ہو جانا اس کے بیمار خاوند کے لئے کس قدر مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ جون کے لئے یہ زہر سے کم نہ ہوگا۔ اس نے جون کی پیشانی کا ایک طویل محبت آفریں بوسہ لیا۔ اور بولی۔

''نہیں ڈارلنگ، کچھ بھی تو نہیں ——!'' اور یہ کہتے کہتے اس کا دل بھر آیا اس کے جی میں آئی کہ آج وہ جون سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کچھ اس قدر کہ اس کا درد ڈھل کر بہہ

جائے۔ وہ لرزتا ہوا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے رہی..... دبائے رہی.....

''بہت خون آیا ہے ——— ہے نا ڈورا ——؟''

اور ڈورتھی نے سوچا۔ جواب میں کہہ دے۔ نہیں، مگر وہ سامنے پڑے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ جو فرش پر جم کر کلیجی کی طرح ہو گیا تھا۔ ایک سخت اور پتھریلی حقیقت جس سے فرار ممکن نہیں۔ وہ جون کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ اب جون اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر جنگلے سے باہر کھلے ہوئے آسمان کو تک رہا تھا۔ جہاں درختوں کے جھنڈ پر سے چاند اوپر اٹھ رہا تھا۔ جس کے چہرے پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس کے سوگ میں، نہ جانے کس غم میں.....!!!!

اور اب تو اسے جون کی زندگی سے مایوسی ہو چلی تھی۔ وہ جون کے قریب اسٹول پر بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی رہتی۔ اس کے کانوں میں جیسے کوئی کہتا رہتا۔

''یہ سب جھوٹ ہے ڈورتھی۔ یہ ڈاکٹر سب جھوٹ بولتے ہیں۔ جون پھر سنبھل نہیں سکتا۔ جون اب جی نہیں سکتا۔'' بیس روز کی لگاتار محنتوں اور انتھک کوششوں کے بعد جب اس کی صحت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ تو اسے کتنی مسرت ہوئی تھی۔ جیسے شش جہت کی دولت مل گئی ہو۔ کتنی مصیبتوں سے وہ اس کا علاج کراتی رہی۔ دفتر کے مینجر سے پیشگی مانگی۔ اس نے دھتکار دیا۔ نوکری چھوٹ گئی۔ ڈاکٹروں کی خوشامدیں کیں۔ حتیٰ کہ اس کمینے جیولر کی گالی تک سننی پڑی اس دوران میں اس کا نوکر تک بھاگ گیا۔ جون کے علاج کے ساتھ ساتھ گھر کے سارے چھوٹے بڑے کام اسے خود سنبھالنے پڑے۔ اور اب اس کی تمام محنتوں اور کوششوں پر پانی پھر گیا تھا۔ جیسے ساحل کے قریب آئی ہوئی ڈورتھی کو پھر کسی غیر مرئی ہاتھ نے سمندر کے بیچ دھکیل دیا ہو۔ یہ دیکھ کر اسے کتنا صدمہ ہوا۔ آہ!! ڈوبتے کو تنکے کا بھی سہارا نہ رہا۔

سمندر میں ڈوبی ہوئی ڈورتھی نے سوچا۔ ''اگر جون مر گیا تو؟'' جیسے کسی نے اس کے سینے پر میخ رکھ کر زور سے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر اپنے ذہن پر ابھرتی ہوئی تصویر کو بڑی بے دردی سے نوچ پھینکا۔ وہ کسی حالت میں جون کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر وہ خالی الذہن ہو کر جون کو دیکھتی رہی۔ جس کے چہرے کی سرخی اس کے خون کے ساتھ بہہ گئی تھی۔ اور جون ہلدی کی طرح زرد ہو کر رہ گیا تھا۔ ہڈیوں کے ڈھیر جون کی طرف دیکھتے دیکھتے اس نے

اپنے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھا۔ جہاں وہ جون کے ساتھ زندگی کے حسین ترین لمحات گذار چکی تھی۔ زندگی کا کارواں مسکراہٹوں اور رنگینیوں کے جلو میں گزر رہا تھا۔ اس وقت جون کس قدر خوبصورت اور وجیہہ تھا کہ وہ اسے دیکھتی ہی رہتی اور کبھی نہ تھکتی ——— جب جون لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آتا اور اپنے بھرے بھرے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اپنا شہد آگیں ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیتا۔ تو ڈورتھی کو احساس ہوتا کہ جون کے ہونٹوں کی مٹھاس بوسے کے ذریعہ اس کی روح میں اترتی جارہی ہے۔ اور اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ اس شہد میں بھیگ گیا ہے۔ اور وہ سوچتی کہ کاش تمام زندگی اس کیفیت کی لذّت کے سہارے گذر جاتی۔ اسی طرح وہ جون کی گرفت کی قید میں رہتی اور صدیاں گزر جاتیں۔ اے کاش! لیکن پھر وہ جون کے دفتر چلے جانے کے بعد حد درجہ مغموم رہتی۔ تنہائی کا عارضی احساس اس کی حیات پر کچھ اس طرح مسلّط ہو جاتا کہ وہ بارہا جون کو دیکھنے کے لئے اس کے دفتر تک جانے کا ارادہ کر لیتی۔ مگر صرف ارادہ۔ اور جب کبھی جون کو دفتر سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی۔ تو ایک ہندوستانی پردے میں رہنے والی خاتون کی طرح بے چین ہو اُٹھتی۔

گھر میں ایک نوکر تھا۔ تنہائی اور بیکاری کے اذیت ناک لمحوں سے چھٹکارا پانے کے خیال سے وہ کسی مصروفیت میں کھو جانا چاہتی تھی۔ اور جب اس نے اپنے اس عندیہ کا ذکر جون سے کیا تو جون نے صلاح دی کہ وہ کہیں نوکری کر لے وہ جون کی باتوں کو کب نہ مانتی تھی۔ اس نے حامی بھر لی۔ تھوڑے دنوں بعد ڈورتھی ایک دفتر میں نوکر ہو گئی۔ دفتر جانے سے ایک گھنٹہ قبل ہی وہ اور جون گھر سے نکل جاتے۔ وہ سائیکل کے آگے بیٹھی رہتی اور جون چلا رہا ہوتا اور سائیکل دو رویہ درختوں سے گھری ہوئی سڑک کے سینے پر مونگ دلتی جارہی ہوتی۔ راستے میں اِکا دُکا آنے جانے والے راہ گیر انہیں بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے اور سائیکل کو لتار پر چرچراتی ہوئی نکل جاتی۔ اور جب کوئی آس پاس آدمی نہ ہوتا تو جون اپنا ایک چوتھائی بوجھ اس پر ڈال دیتا اور پھر بے خیالی میں اس کی گردن کے نیچے سے اپنا منھ لا کر اس کے گالوں کو چوم لیتا۔ سائیکل ڈگمگا کر رہ جاتی۔ اور وہ بظاہر غصّے کا مظاہرہ کرتی تو جون ایک طویل قہقہہ لگاتا ——— جون اسے دفتر میں چھوڑ کر اپنے دفتر کو ہو لیتا۔ اور جب وہ دفتر سے نکلتی تو دیکھتی کہ جون سائیکل لئے اس کا منتظر ہے۔ انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ کبھی جون کسی وجہ سے خلاف معمول نہ آسکتا

تو پھر وہ گھر میں جا کر جون سے خوب لڑتی۔ بالکل اپنے پڑوس میں رہنے والی مسلمان عورت کی طرح۔ ڈورتھی کی زندگی پر جون اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ چھایا ہوا تھا۔ دفتر میں کچھ کر رہی ہو۔ اس وقت بھی جون اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہوتا یا اس کے گالوں کو چومنے کے لئے بڑھ رہا ہوتا ——— کام کرتے وقت وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جون اس کے سامنے نہ آجایا کرے۔ اس طرح تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گی۔ ایسی جذباتیت بھی کیا؟ اسے وہ دن آج بھی یاد ہے جب اس نے نوٹس لیتے ہوئے بے خیالی میں کاپی کے حاشیے پر جا بجا۔ ''جون ڈارلنگ'' لکھ دیا تھا۔ جسے اس کے قریب میں بیٹھنے والی لڑکی نے بتایا تھا۔ اور وہ چونک کر اس کو مٹانے میں محو ہو گئی تھی۔ کتنی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت ——!

اور اب جون کی کھانسی نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ شاید دوا اور انجکشن نے اثر کیا تھا۔ یا شاید نقاہت کے باعث وہ کھانس نہ سکتا تھا۔ ڈورتھی اوگالدان اس کے قریب لائی۔ اس نے کھنکھار کر اس میں تھوک دیا۔ دو دن سے قریب قریب خون آنا بالکل بند ہو گیا۔ مگر پھر بھی تھوک کے ساتھ ہلکی سرخی آ ہی جاتی پلنگ کے نیچے اوگالدان رکھ کر ڈورتھی نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ڈاکٹروں نے کیا کہا ڈورا؟ کیا میں مر جاؤں گا؟؟'' جون نے گلاس واپس دیتے ہوئے کہا۔ جیسے بالکل ہار گیا ہو۔

''کیسی باتیں کرتے ہو ڈارلنگ ———؟ ڈاکٹروں نے تو امید دلائی ہے کہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ دیکھو نا خون بھی آنا بند ہو گیا ہے۔ اور ٹمپریچر بھی نہیں رہتا ایسی باتیں سوچ کر تم کیوں اپنے کو ہلکان کرتے ہو۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیا کرو ڈارلنگ ——— خدا کے لئے ——— میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے ———!'' اور یہ کہتے کہتے ڈورتھی کی آنکھیں بھر آئیں لیکن اس نے ضبط کر لیا۔ آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں خشک ہو گئے۔ جون چپ چاپ کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صاف اور بے داغ آسمان، ڈورتھی کی زندگی کی حسین اور پاکیزہ آسمان کی وسعت کو وہ تک رہا تھا۔ اچانک اس نے چہرہ پھیرتے ہوئے کہا ———

''ڈورا، تمہیں یاد ہے، وہ شام؟ ہماری شادی کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے۔ ہنی مون منانے کے لئے ہم وارجلنگ گئے ہوئے تھے۔ صاف شفاف، جھیل کے کنارے بیٹھی تم مجھے نغمے سنایا کرتی تھیں، بائرن کی نظمیں لپٹکن کی کے نغمے، ٹیگور کے گیت یا کبھی کبھی چاندنی راتوں میں،

درخت تلے مون لائٹ اینڈ شیڈو MOONLIGHT AND SHADOW اس وقت زندگی کتنی خوبصورت تھی ڈورو — ؟ اور اس روز جب میں نے تمہیں شیلے کی نظم سنانے کو کہا۔ تو تم نے یونہی ناز سے کہا "نہیں" پھر بڑی دیر کی منت سماجت کے بعد تم کتنی پرسوز آواز میں گانے لگی تھیں۔

"................ جب تم نہیں ہوتے ...."

"جیسے ساری کائنات تمہاری آواز کے سحر میں ڈوبی جا رہی تھی۔ ڈارلنگ! کیا مجھے تم وہ نغمہ آج پھر سناؤ گی؟ وہی، جب تم نہیں ہوتے، وہی شیلے کی نظم —!"

اور جون نے آسمان کی طرف چہرہ پھیرتے ہوئے بڑی ملتجی انداز میں دیکھا۔ جون کے منع کرنے کے باوجود ڈورتھی اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے اس سے اس وقت کچھ گایا نہ جائے گا۔ وہ گذرے ہوئے خوشی کے لمحوں کو یاد دلا کر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی جون کا پریشان ہو جانا اس کے لئے سوہان روح ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں گائے گی۔

"تم گاؤ گی ڈارلنگ —— ؟"

اور جیسے ڈورتھی کے لاشعور سے آواز آئی — "ہاں گاؤں گی" —— اور وہ گانے لگی۔
ہلکی ہلکی مدھم آواز میں، جیسے کوئی روح کو زخمی کرتا چلا جا رہا ہو۔ اور احساس تک نہ ہو رہا ہو۔

موسیقی ——
جب نقرئی آواز کھو جاتی ہے، ذہنی فضا میں تھرتھراتی رہتی ہے۔

خوشبو ——
جب مخملیں پھول پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ اس حس میں زندہ رہتی ہے۔ جس کو اس نے بیدار کر دیا ہے۔

گلاب کی پتیاں ——
جب گلاب بکھر جاتا ہے۔ محبوب کی سیج پر بکھیر دی جاتی ہیں۔ اسی طرح تیرے خیال پر
جب تو میرے پاس نہیں ہوتا —— خود عشق آرام کرتا ہے۔

رفتہ رفتہ جون کی حالت سنبھلتی جا رہی تھی۔ اگرچہ اسے کھانا وانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور اجابت نسبتاً زیادہ ہونے لگی تھی۔ لیکن ڈورتھی اور ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ جون مائل بہ صحت ہے۔

خون آنا قطعی بند ہو گیا تھا۔ بخار بھی نہیں آتا۔ قے اور دست تو شاید موسم کی خرابی یا دواؤں کے زیادہ استعمال کے باعث ہوتا تھا ڈورتھی کی محنت اور روپے خلاف توقع ضائع نہیں ہو رہے تھے۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے اسے ایک فکر دامنگیر ہوتی جا رہی تھی۔ پیسے کا خرچ زیادہ تھا اور آمدنی کا راستہ مسدود۔ اس نے اپنا ہار بیچ دیا۔ سامان فروخت کر دیئے۔ بینک میں جون کے نام سے رکھے ہوئے وہ روپے جو جون کے والد مرتے ہوئے اسے دے گئے تھے۔ قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ وہ کہاں جائے اس تاریک دنیا میں اسے دور نزدیک روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈورتھی چپ تھی، آس پاس اندھیرا تھا۔ وہ ڈورتھی جو جون سین تھی لامار نہیں تھی جو ہندوستان کے چھوٹے سے شہر میں مفلس قلاش پڑی تھی۔ کوئی بھی نہ تھا جو اس کی آنکھوں میں سے اُمڈتے ہوئے آنسو کو خشک کرتا۔ مایوسی کے اس تیرہ و تار ماحول سے نکالتا۔

—اب تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا جسے بیچ کر وہ اس کا علاج.....

''اگر زیور نہ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ میڈم..... صرف آپ کا ہونا کافی ہے.....'' جیسے دور بہت دور سے ایک منحنی سی آواز آ رہی تھی۔ اور وہ بنگالی جیولر اس اتھاہ تاریکی میں مینارۂ نور کی طرح ابھرتا سا دکھائی دیا—— جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا..... بنگالی جیولر .....اور ڈورتھی نے اپنے ذہن پر ابھرنے والی تصویر کو بڑی بے دردی سے نوچ پھینکا..... اگر زیور نہ ہو..... اگر زیور نہ ہو..... اگر زیور نہ ہو..... ڈورتھی نے گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں——!!!''

''ڈورتھی——! ڈورو! تم بولتی کیوں نہیں؟؟''

''ہاں'' وہ بولی مگر جیسے اس کے پاس بولنے کو اور کچھ نہ رہ گیا ہو

''ڈورتھی، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اب میری باتوں کا جواب بھی دینا گوارہ نہیں کرتیں۔ کل اسٹرپٹومائی سین کے انجکشن بھی نہیں دلائے جا سکے۔ ڈاکٹروں نے سینی ٹوریم میں داخل کروانے کو کہا تھا۔ تم سے وہ بھی نہ ہو سکا۔ آخر تم کیا چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں؟'' یہ کہتے کہتے جون کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی آواز رُندھ گئی۔ اور ڈورتھی کو ایسا لگا، جیسے کسی نے سینے میں نشتر چبھو دیا ہو—— وہ تڑپ اٹھی۔

''نہیں نہیں، جون ڈارلنگ، تم ایسا نہیں کہو۔ تم خدا کے لئے یوں نہ کہو——!'' اس کا

جی بھر آیا۔ اور وہ سب کچھ بھول کر، سب کچھ فراموش کر کے اس کے گالوں سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور یہ دیکھ کر جون ضبط نہ کر سکا۔ گھنٹوں وہ روتے رہے۔ گھنٹوں..... جیسے سارا دکھ، سارا درد ڈھل کر بہہ رہا ہو۔ جیسے کائنات میں بجز دونوں کے اور کوئی نہ ہو ——!!

''ڈورتھی ——؟''

اور ڈورتھی بدستور سائیکل میں ہوا بھرتی رہی۔

''ڈارلنگ؟''

ڈارلنگ چُپ رہی۔

''ڈورو تم مرتو نہیں گئیں ——؟''

''کیا ہے ڈارلنگ ——؟'' خیالوں میں کھوئی ہوئی ڈورتھی چونکی اور اس نے سوچا، کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش وہ یہ سب دیکھنے کے..... پہلے مر گئی ہوتی اے کاش ——!

''تم آج کہاں جا رہی ہو ڈورو ——؟''

ڈورتھی نے پمپ سائیکل سے نکالتے ہوئے کہا۔

''روشنی لانے، گھر کی تاریکی کے لئے روشنی تو چاہئے ہی ——!''

''میں سمجھا نہیں، تم آج کیا کہہ رہی ہو ——؟''

''سچ کہہ رہی ہوں ڈارلنگ —— پڑوس والی مسلمان عورت کہتی ہے کہ جنت میں پھول ہوتے ہیں اور جہنم میں آگ۔ میں آج جہنم جا رہی ہوں۔ جہنم سے روشنی لانے ——!'' اس کی آواز میں درد تھا، روحانی کرب، اور اذیت کا پرتو تھا —— اور وہ باہر نکل گئی۔ دورو یہ مکانوں اور درختوں سے گھری ہوئی سنسان اور بیوہ کی چھاتی کی طرح تنہا رہنے والی سڑک کے سینے پر ڈورتھی کی سائیکل مونگ دلتی ہوئی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ آہستہ آہستہ جیسے چکّے کی ہوا نکل گئی ہو۔ اور ڈورتھی سائیکل پر بیٹھی اپنے ماحول سے لاپرواہ سوچ کے سمندر میں ڈوبی رہی —— آج اسے یہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔ آج وہ خود اس پستی میں گرنے جا رہی ہے۔ کچے دھاگے سے بندھی ہوئی ایک غیر محسوس طاقت کے ماتحت سوچتی ہوئی آنکھوں سے بہہ آنے والے سیلاب کو روکے ہوئے۔

سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی گرجا کی عمارت اس کے قریب آ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں آپ ہی آپ یسوع مسیح کے مجسّمے پر جا لگیں۔ یسوع کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کسی کو اپنی

پناہ میں لے لینا چاہتا ہو۔اور اس کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ تھی۔اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔جیسے کہہ رہے ہوں۔"

"لڑکی اُٹھ.....!لڑکی،اس پستی سے اُٹھ.....!!اُٹھ لڑکی اُٹھ.....!!" ڈورتھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس کے جی میں آئی کہ اس آواز پر لبیک کہے اور یسوع کے قدم پر گر کر اتنا روئے کہ اس کا سارا درد،سارا غم بہہ جائے،لیکن جون ——— ؟؟

اور اُس کی سائیکل آگے بڑھ گئی۔

"لڑکی اُٹھ،اس پستی سے اُٹھ.....!!" یسوع مسیح کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

"لڑکی.....اُٹھ.....!"

اور اس کی سائیکل جیسے آپ ہی آپ ایک چکر کاٹ کر گھوم گئی اور ڈورتھی اتر کر یسوع کے قدموں پر گر پڑی اور پہروں روتی رہی۔

اور جب یسوع کے قدموں سے الگ ہوئی تو فضا پر دھندلکا چھانے لگا تھا اور اس نے محسوس کیا جیسے واقعی اس کے دکھ کا بار گراں ہلکا پڑ گیا۔اسے جون کا خیال آیا۔اور وہ سائیکل لئے تیزی سے اپنے گھر کی طرف لوٹی۔اس نے سوچا،وہ جا کے جون کو سینے سے چمٹا لے گی۔اور کہے گی۔دیکھو،ڈارلنگ!میں کتنی بشاش ہوں،دیکھو میں روشنی لے آئی۔ایک مقدس روشنی.....

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کمرے میں دھندلکا گہرا ہو گیا ہے۔اور اس دھندلکے میں جون بے خبر سو رہا ہے۔اور بے خیالی میں اس کا ایک ہاتھ پلنگ سے باہر لٹک رہا ہے اور کمرے میں اس کا گایا ہوا شیلے کا نغمہ ابھی تک گونج رہا ہے۔

گلاب کی پتیاں:۔

جب گلاب بکھر جاتا ہے،محبوب کی سیج پر بکھیر دی جاتی ہیں۔

اسی طرح،تیرے خیال پر جب تو میرے پاس نہیں ہوتا۔

خود عشق آرام کرتا ہے۔

بدصورت سیاہ صلیب

پھر یوں ہوا کہ دن بھر کی جلی بھنی دنیا یکا یک گھنگھور گھٹاؤں کے چھا جانے کے باعث ٹھنڈی پڑ گئی۔ اور پھر ٹوٹتے ہوئے دن کے سمئے بارش نے تو اور بھی فضا کو خوش گوار کر دیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مغربی دریچے سے اندر آیا جس کے باعث ڈی سوزا کے گرم جسم نے ایک تراوٹ سی محسوس کی۔ ریڑھ کی ہڈی کے درمیان دیر سے پھنسا ہوا پسینے کا ایک قطرہ ڈھلک گیا۔ اس کے دل میں ایک دل نواز سی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو ریشم کے سبک جھولے پر ایک پینگ سی کیفیت میں محسوس کیا۔ عین اسی وقت گھڑی نے چار بھی بجائے۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے محسوس کیا، گویا قدرت آج اس پر کچھ مہربان ہے۔

شام کی ذرا سی بارش بھی کتنی خوش گوار ہوتی ہے۔ ساری فضا زندگی بکھیر دیتی ہے۔ روح میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر سڑک کے دونوں طرف درختوں کی قطار کو دیکھا۔ ننھے ننھے پتے ہوا کے جھونکوں سے ایک والہانہ رقص میں محو تھے۔ کہیں کہیں پتوں پر بارش کا ایک آدھ قطرہ موتیوں کی طرح سنہری دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ ہوا شاخوں سے سرگوشیوں میں مصروف تھی۔ کوئی شریر جھونکا اس کی زلفوں کو چھیڑ جاتا، تو وہ آپ ہی آپ شرما جاتی۔

''ہلو سوزا ــــــ!''

ایک بڑے سے درخت کے نیچے مارگریٹ، ڈولی، اور فینی شوخ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس بے حد خوش، بے حد مخمور بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ آج اس موسم سے لطف اندوز ہونے کا پورا امکان ہے۔ اور یہ رومان پسند لڑکیاں کہیں چوک سکتی ہیں۔

''ہلو ڈارلنگز!'' خلاف دستور وہ چہک کر شوخی سے بولی ''کیا تمہارا کچھ کھو گیا ہے، جس

کی تلاش میں.....''

''کیا تمہارے پاس بھی کھونے اور پانے کے لئے کچھ ہے؟'' پھر تینوں کھلکھلا کر اتنے زور سے ہنس پڑیں کہ وہ ایک دم سے دنگ رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ، بجھی بجھی سی خفت اور شرمندگی پھیل گئی۔ خلاف توقع یہ جواب اس کے لئے مہنگا پڑا۔ اس کے مزاج کی ساری بشاشت کافور ہوگئی۔ اس کا پاؤں سڑک کے کنارے والے گندے پانی سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں پڑا۔ اور پانی اُڑ کر اس کے جرابوں کو جہاں تہاں سے بھگو گیا۔

''نان سنس، آوارہ ــــ!''

ڈی سوزا رُک گئی۔ وہ مردوں کو ایسا کیوں کہتی ہے۔ یا کہنے پر مجبور ہے؟ جواب اسے نہیں ملا۔ الجھی الجھی سی کیفیت نے اس کے اعصاب کے گرد جال سا بن دیا تھا۔ کیوں کہتی ہے وہ ایسا؟ کیوں کہتی ہے؟ اس نے اپنے آپ سے بارہا سوال کیا۔ مگر..... اسے اطمینان نہ ہوا۔ وہ اس مسئلے پر پھر کبھی سوچے گی۔ پھر کبھی کسی دن اطمینان سے ــــ!

دفتر سے واپسی پر جس پان والے کی دکان سے وہ پمی کے لئے دو آنے کی ٹافی ہر روز بلا ناغہ خریدتی ہے۔ وہاں ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا ہے۔ اکثر اس کے دل میں آتا کہ ایک پتھر اٹھا کر اسے چور چور کر دے۔ اس وقت وہ بے خیالی میں آ کر اسی پان والے کی دکان کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر لگے ہوئے شفاف آئینے میں ایک اجنبی چہرہ، بدصورت، چیچک سے بھرا ہوا چہرہ، بال خشک، روکھا اور آنکھیں گول گول.....!!

''یہ ٹافی میم صاحب!'' تنبولی نے دوسرے گاہکوں سے نپٹنے کے بعد چار ٹافیاں اس کی طرف اچھال دیں۔ اس نے معاً ہاتھ اٹھا کر چاروں ٹافیاں لوک لیں۔ ابھی نالی میں گر جاتیں تو ــــ! مگر یہ جملہ ادا کرنے سے پہلے ہی ڈی سوزا کو اس کا جواب مل گیا۔ مگر گرتیں کیسے؟ ہر روز جس قدر مشینی انداز سے ٹافیاں اچھالتا ہے۔ اسی قدر مشینی ڈھنگ سے وہ لوک لیتی ہے۔ اسے اطمینان سا ہوا۔ اچھا ہے۔ ہر کام ایک بندھے بندھائے انداز سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے کوئی نئی بات تو ہو۔ وہی گھر سے دفتر، دفتر سے جانی پہچانی سڑک سے گھر۔ ماں کے زخم کی ڈریسنگ، پمی کو پیار، پھر ریوالی کی بکنگ ــــ پھر گھر ــــ اور بستر.....

صبح ہوئی ــــ، ــــ شام ہوئی

صبح ہوئی ـــــ، ـــــ شام ہوئی

زندگی تمام ہوئی ـــــ زندگی ـــــ زندگی .....!

''بے بی یہ زندگی بھی کیا ہوئی۔ ایک مانگی ہوئی روشنی ـــ!'' اس کی ماں ہر روز اس وقت یہ جملہ دہراتی جب وہ اس کی ران کے گندے اور متعفن ناسور کو ڈریسنگ کر رہی ہوتی ہے۔ ایک موٹی بھدی بھینس کی طرح اس کی ماں ہر روز اپنی آبنوس کی سی پلپلی ران کھول کے اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک گندے پیپ اور خون سے بھرے ہوئے تالاب میں ابھرتی ڈوبتی محسوس کرتی ہے۔ ''شمع خود جلتی ہے۔ مگر دوسروں کے گھروں کو روشنی دینے کے لئے۔ لہٰذا اس مانگے ہوئے نور کو ضائع نہ کرو ـــــ'' پھر کوئی کہانی جس کا لب ولباب یہ ہے کہ ڈی سوزا اس کے اور اس کے ناکارہ شوہر اور بیٹے کی ضرورتیں پوری کرتی رہے اور بس ـــــ اور بس ـــــ اس کے آگے کچھ نہیں۔

ابھی اس نے کمرے کے اندر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ رابرٹ سامنے آ گیا۔

''سسٹر پانچ ـــــ صرف پانچ روپے چاہئیں ـــ!''

اس کی مسکین صورت سے ڈی سوزا کو بڑی نفرت ہے۔ اس کے باوجود اس مسکینی میں ضرور کوئی جادو ہے جو اس کے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ ''مگر پی تو رکھی ہے تم نے اور کیا؟''

''مجھے نہیں پینا، بائی گاڈ ـــــ'' اس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ـــــ ''وہ روزی ہے نا ـــــ اسے!''

''ڈی سوزا دنگ رہ گئی ـــــ اتنا سا لڑکا۔ صرف سولہ برس کا لڑکا رابرٹ روزی کے ساتھ عشق بھی کر سکتا ہے۔ اور پھر کس بے حیائی سے یہ سب کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ گویا یہ کوئی بات ہی نہیں۔ رابرٹ کی جرأت دیکھ کر وہ دھک سے ہو گئی ـــــ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ سرج کی اونچی پتلون، اس پر نیم عریاں لڑکیوں کی تصویروں سے بھری ہوئی بس شرٹ، گلے میں سرخ رنگ کا رومال بکھرے بکھرے بھورے بال چھوٹی چھوٹی گندی آنکھیں، خمار میں ڈوبی ہوئی .....

.....ڈی سوزا کو یہ لڑکا کچھ اجنبی سا لگا۔

''کیوں روزی کو شراب پلائے گا۔ بتا تو؟ کیا لگتی ہے وہ تیری؟؟ ـــــ'' کانپتی ہوئی آواز میں ڈانٹنے لگی۔

یہ سن کر رابرٹ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''بائی گاڈ، تم خوب جانتی ہو سسٹر!'' ہونٹ کو عجیب فحش انداز سے دانتوں سے دبا کر اس نے آنکھ ماری۔ ''تم سب جانتی ہو۔ سب کچھ ——!!''

ڈی سوزا گھبرا کر اندر چلی گئی۔ اگر اس کے بعد بھی وہ کھڑی رہتی تو جانے کیا کر بیٹھتا اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ دل دھڑکنے لگا۔ ''سسٹر جا رہی ہو''، لپک کر رابرٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''اور روپے پلیز ——!''

''نہیں نہیں، میں ایک پیسہ بھی نہیں دوں گی۔''

ڈی سوزا نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل روا تھا۔ سامنے ٹائیلٹ میز پر فریم کے اندر یسوع مسیح افسردگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں کیا جانتی ہوں خداوند؟ یہ ذرا سا بچہ میرے ساکن تالاب میں کتنا بڑا پتھر پھینک گیا۔ دن بھر دفتر میں اور آدھی رات تک سنیما میں محنت بیچتی ہوں۔ اپنی بیمار اور دکھی ماں کے گندے زخم کی ڈریسنگ کرتی ہوں۔ رابرٹ کو خوش رکھتی ہوں..... میں کیا جانتی ہوں گاڈ —— میں نے کب تمنا کی ہے کسی کی؟ اکیلے سنگ دل بستر، مجھے کچھ نہیں ملا۔ کبھی کچھ نہیں ملا —— وہ زور زور سے رونے لگی۔ میز پر سر رکھ کر بہت دیر تک روتی رہی کب اندھیرا ہوا اسے پتہ نہیں چلا۔ جب کسی ضرورت سے بیساکھی ٹیکتی ہوئی اس کی ماں کمرے میں آئی تو اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

''ارے بے بی تم یہاں ہو ——!'' اس کی ماں نے تعجب سے کہا، میں ڈر رہی تھی، پتہ نہیں دفتر میں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ تیری طبیعت خراب ہے بے بی؟'' اس نے ڈی سوزا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''نو ممی ٹھیک ہوں —— چلو جلدی تمہاری ڈریسنگ کروں، سنیما کا فرسٹ شو تو گیا۔'' اس نے آنسوؤں کو روک لیا۔

''نہیں آج چھوڑ دو۔ تم نے چائے بھی نہیں پی ہے۔ چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو، ناشتہ کر لو، پھر چلی جانا۔''

''نہیں، آج تین دن ہو گئے۔ ڈریسنگ کرنا ہی ہو گی۔ چلو میں ابھی کیے دیتی ہوں۔'' اس کی ماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ ''خدا تمہیں سلامت رکھے تم نہ

ہوتیں بے بی، تو پتہ نہیں کیا حالت ہوئی ہوتی اب تک۔ تو میرا بیٹا ہے۔"

"تمہارا بیٹا ——" اس نے بڑی نفرت سے کہا۔ "تمہارا بیٹا رابرٹ ہے نا ممی؟"

ڈی سوزا نے دیکھا، کمرہ تاریک ہو رہا ہے اور ابھی روشنی نہیں جلائی گئی ہے۔ اس نے اٹھ کر بلب روشن کیا۔ دونوں کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے کو جھٹک کر الگ کر دیا۔ سامنے بنگالی بابو کے باغ سے پھولوں کی خوشبو لئے اس کے چہرہ، نتھنے اور بالوں سے الجھتا ہوا ہوا کا سیلاب سا کمرہ میں آ گیا۔ دل نواز خوشبو نے ذرا دیر کے لئے ڈی سوزا کو احوال سے بے خبر کر دیا۔

'کیا کیا رابرٹ نے؟" اس کی ماں پوچھ رہی تھی۔

"رابرٹ!!" ڈی سوزا رک گئی۔ ابھی ابھی رابرٹ کے نام پر نفرت کی ایک لہر سی اس کے دل میں اٹھی تھی۔ وہ لہر اس کے دل کے سمندر میں کہیں گم ہو گئی —— اس نے جلدی سے کہا۔ "کچھ نہیں ممی، رابرٹ بڑا شریر ہو گیا ہے!"

ہاں ہاں —— سوزا وہ بہت شریر ہو گیا ہے۔ ایک دن جانتی ہو کیا کہہ رہا تھا؟ کہہ رہا تھا سسٹر ڈارلنگ کی شادی کر دو۔" یہ کہہ کر ممی زور سے کھوکھلی ہنسیں۔ ایک دم سے ننگی ہنسی۔

ڈی سوزا تڑپ اٹھی۔ اس ہنسی کو وہ خوب جانتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ کبھی کبھی اس کا عندیہ جاننا چاہتی ہے۔ خداوند —— خداوند یسوع مسیح —! اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تیری دنیا کیسی مطلب پرست ہو گئی ہے کتنی خودغرض اور مکار بھی۔ ضرورتوں نے اس کی ماں — پیاری ماں کو کتنا کمینہ اور مکار بنا دیا ہے۔ مگر ذرا دیر میں ڈی سوزا کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کے برے دنوں کی، دکھوں سے بھری بے شمار تصویریں پھر گئیں۔ کہیں سے ابل کر ذرا سا پیار آ گیا۔ اس نے اپنی ماں کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔ اور اس کے سیاہ —— مردہ چہرے کی طرح بدرونق گال کو چومتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"میں سب جانتی ہوں ممی —— سب کچھ۔ مگر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی!"

نہ جانے کہاں سے اس کی ماں کی ریگستان کی طرح خشک آنکھوں میں پانیوں کا سیلاب آ گیا۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے سوزا کو بھینچ لیا۔ "ایک روز میں نے تمہارے پپا سے کہا۔ ڈارلنگ!" وہ رک گئی۔ اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ پھر ممی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "کچھ

نہیں۔ میرا مقدر شروع ہی سے خراب ہے سوزا، میں بڑی بدنصیب ہوں ——— ''پھر وہ منہ ہی منہ میں بدبداتی، آستین سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے، بیساکھی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔ گرم گرم چائے۔'' جاتے جاتے اس نے کہا

ڈی سوزا کو حیرت نہیں ہوئی۔ ذرا دیر کے لئے اس کی آنکھوں پر بھی آبی پردہ پڑ گیا تھا، جسے اس نے ہٹا دیا۔ دس سال میں کتنی بار وہ ممی کے دکھوں کے سمندر میں ڈوبی ابھری ہے۔ کھونٹ کھونٹ دیکھ ڈالا ہے اس نے اب اس میں کوئی نیا پن نہیں، کوئی کشش نہیں۔

بارہ برس پہلے ایک روز اس کا باپ کلکتہ کے لئے نکلا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ جب سے ممی کی زندگی دکھوں سے چور ہے۔ اس نے کلکتہ کی گلی گلی ڈھونڈ ڈالی۔ شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر اس کا شوہر اسے نہیں ملا۔ ہر نیا دن اس کی زندگی کو بدرنگ کر کے گزر جاتا۔ اور ہر صبح اس کے چہرے کی رونق لٹتی گئی، لٹتی گئی............!

اس کی ماں نے سینکڑوں بار اپنے پاؤں کے ناسور کی ڈریسنگ کراتے ہوئے ڈی سوزا کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ ''مگر میں شروع سے ایسی بدرونق تھوڑی ہوں۔ میں تو بہت اچھی دکھتی تھی۔ میرے پپا ——— یعنی تمہارے گرانڈ فادر کہتے تھے۔''

پھر وہ گرانڈ فادر کی زبانی دہرایا ہوا اپنے بچپن کا سینکڑوں بار سنایا ہوا وہ واقعہ بیان کرتی کہ کب ایک بار ہندوستانی جاگیرداروں، راجاؤں، اور اونچے درجے کے زمینداروں کی محفل میں وہ یعنی ڈی سوزا کا نانا اپنی بیوی کے ساتھ موجود تھے۔ جہاں ان کے ساتھ ان کی تین سالہ بچی بھی تھی۔ جب ایک بڑے جاگیردار نے پیار سے اس کی اکلوتی بچی کو گود میں اٹھا کر بے حد پیار سے کہا تھا۔ اور بے انتہا چاؤ سے پپا کو یقین دلایا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں اتنی پیاری، اتنی خوبصورت بچی نہیں دیکھی۔''

''جانتی ہو بے بی یہ بچی کون تھی؟''

''جانتی ہوں ممی، سب جانتی ہوں۔'' ڈی سوزا اکتاہٹ سے جواب دیتی۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے پپا جو بارہ سال قبل گھر سے بھاگ گئے ہیں۔ اس کی وجہ کوئی اور تھی ——— ڈی سوزا نے ہنستے ہوئے بڑی شگفتگی سے کہا تھا۔ پھر یہ جملہ سن کر اس کی ماں چپ ہو گئی تھی اور ادھوری

ڈریسنگ کئے اٹھ گئی تھی۔ شاید اندر کمرے میں جا کر رہی بھی ہو۔ مگر اس دن کے بعد اس کی ماں نے کبھی اپنے پپا کا وہ مشہورِ زمانہ قصہ نہیں دہرایا۔ جس کا ڈی سوزا کو بہت افسوس ہوا۔

''ممی کے دکھوں کا سمندر کتنا گہرا ہے اور کتنا وسیع — خداوند — میری اماں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ اس کے گناہ معاف کر۔'' ڈی سوزا نے سینہ پر صلیب بنائی۔

''شاید اس نے بھول چوک میں کوئی غلطی کی ہو۔ اسے معاف کر —''

ممی کے دکھوں کے لئے خداوند خدا سے معافی مانگتے مانگتے وہ یوں رونے لگی گویا — گویا وہ خود اپنی ممی ہو گئی ہے۔ بے حد سیاہ، بے حد موٹی، اور جسم کسی گوالے کی بھدی بھینس ....!

''ممی میرے دل کے دھڑکنوں کو کیا ہو جاتا ہے بیٹھے بیٹھائے —؟ پتہ نہیں کس جذبے کے تحت وہ ایک دن اپنی بوڑھی، کم ہمت ماں کو اپنی روح میں جھانکنے کی دعوت دے بیٹھی — یعنی میں جب ریوالی بلڈنگ پر ہوتی ہوں۔ دفتر میں ہوتی ہوں تو تنہائی کے عالم میں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ خاص کر جب رات کو سوتے سوتے اچانک کسی الجھے الجھے خواب ....!!''

پھر ڈی سوزا شرما گئی۔ وہ عجیب عجیب بے معنی خواب کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پا رہی تھی، ژولیدہ، کچھ سرخ، کچھ زرد رنگوں کے ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے ہوئے نامکمل ٹوٹتے ہوئے سے خواب — کبھی کبھی خوبصورت توانا جسم دل کش آنکھیں، تراشیدہ لب، گھنی سیاہ بھنویں، اُبھرتے ڈوبتے اجنبی چہرے، پھر ان بے شمار چہروں کے درمیان گوالے کی بھدّے جسم والی سیاہ بھینسیں جگالی کرتی ہوئی وہیں کہیں یسوع مسیح کا تابناک چہرہ — مسکراہٹ، تقدس — افسردگی —!

اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی — ''پھر ممی ڈارلنگ! اس وقت میرا دل بہت زوروں سے دوڑنے لگتا ہے اور میرے بستر کی چادر پسینے سے تربتر ہو جاتی ہے۔''

اس کی ماں کچھ نہیں کہتی — صرف سر نہوڑائے سنتی رہتی اور آہستہ آہستہ گردن کو یوں جنبش دیتی رہتی گویا وہ ڈی سوزا کی ایک ایک بات کو بڑے غور سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ سے مدبرانہ انداز میں کہتی — ہاں ہوتا ہے — ہوتا ہے — ایسا ہوتا ہے —''

''کیا ہوتا ہے ممی ــــ؟''

جواب میں ممی ہنس پڑتی ہے ــــ کیا ہوتا ہے ــــ کیا ہوتا ہے ــــ مجھے تو اس کا پتہ ہی نہیں، پھر اس کی ماں پرانے اسٹول کی ابھری ہوئی کیل کو سینڈل کی ایڑی سے ٹھونک کر اس پر بیٹھ جاتی ہے۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ خداوند یسوع تجھے بہت چاہتا ہے اور تو اس کے صلیب کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک حور ہے۔ جس کے تقدس۔''

خداوند یسوع میں تمہاری صلیب کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک حور ہوں۔ جو تمہارے مقدس لہو کی بوند بوند کو اپنی روح کے پیالے میں اُتار رہی ہوں۔ اور تم چاہو تو صدیوں یوں ہی اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیتی رہوں گی۔ مگر یہ مجھے کیا ہوتا ہے خداوند کہ بیٹھے بیٹھائے میرا دل بے قرار ہوا اٹھتا ہے۔ اور میرے دل کے ویرانے میں دور دور تک دھول اُڑنے لگتی ہے۔ گرم اور سیاہ دھول۔ کیا مجھے اس سے نجات ملے گی کیا یہ سیاہ بگولہ کسی دن مجھے اپنے ساتھ لے اُڑے گا ــــ؟؟''

بتاؤ، مجھے کوئی بتاؤ ــــ ''میں اس وقت کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟'' ڈی سوزا دل ہی دل میں رو پڑی ــــ

تم مجھے کہیں چھوڑ کر چلی نہ جاؤ۔ بے بی ــــ ڈرتی ہوں ــــ میں بہت ڈرتی ہوں۔ جس وقت تم میرے زخم کو صاف کر رہی ہوتی ہو، گندے پیپ اور خون سے چمچماتے ہوئے زخم کو، تو میں تکلیف سے بے خبر یہ سوچنے لگتی ہوں کہ تم کہیں چلی نہ جاؤ ــــ لیکن پھر یہ سوچ کر دل خوش ہو جاتا ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔ کیوں کہ بے بی سچائی اسے کہتے ہیں جو ہے اور جو نہیں ہے وہ سب جھوٹ ہے ــــ مثلاً اس دنیا میں میرے سوا تمہارا باپ بھی تھا۔ تھا تو تھا۔ پر اب موجود نہیں۔ مثلاً یہ کہ کل تمہارا ایک رفیق حیات بھی ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے ڈیڈی کی طرح وہ بھی تمہیں ٹھکرا کر چلا جائے۔ اس لئے شکوک کی دنیا میں رہنے سے بہتر ہے کہ انسان یہ سمجھنے لگے کہ کل جو تھا وہ بھی جھوٹ تھا اور کل جو ہوگا وہ بھی جھوٹ ہے۔''

''بے بی جو خیالوں کے آسمان پر اُڑ رہی تھی۔ اکتا گئی۔'' ''ہاں ممی، اور آج گزر کر کل میں بدل جائے گا تو وہ بھی محض جھوٹ ہو سکتا ہے کیوں؟''

جس کا جواب ممی کے پاس نہیں۔ اس لئے اس نے کچھ نہیں کہا صرف سوچ کر رہ گئی۔

جب وہ ممی کے زخم کی ڈریسنگ کر چکی۔ اور کپڑوں کی سفید پٹیوں کو اچھی طرح سے کس کر سیفٹی پن سے اسے ٹانک دیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ اب تک ایک گہرے سمندر میں غوطے لگائے ہوئے تھی اور اب جو وہ بہت دیر بعد پانی کے باہر نکلی ہے تو اس کا تنفس ذرا تیز ہو گیا ہے۔ مگر کھلی ہوا نے بنگالی بابو کے باغ سے جھوم جھوم کر خوشبوؤں کا بوجھ لئے ہوئے مست کن ہوا نے اس کے اعصاب کو بیدار کر دیا۔ اس کے جسم کو فضا میں اچھال دیا۔ اسے وہ شام یاد آئی۔ جب کمار سلک ہاؤس کے کاؤنٹر پر ایک رومال خریدتے وقت ایک مدراسی نوجوان نے بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ عجیب نوجوان تھا اسی شام کو اس کی ملاقات ہوئی۔ چند گھنٹے ریوالی میں گزارنے کے بعد خواہش ظاہر کر بیٹھا۔ ڈی سوزا اسے بہت پسند ہے۔ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے —— وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے —— وہ اس کو کہیں لے جانا چاہتا ہے —— عجیب سر پھرا —— جذباتی —— اس دن وہ اس مدراسی لڑکے کو ڈانٹ کر گھر چلی آئی تھی۔ گھر آنے کے بعد اپنی ماں کے زخم دھوتے وقت اس کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس نے بہت درست کیا جو اسے ڈانٹ دیا۔ اس گھر میں، اس کو کیا پتہ کہ اس کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ پھر کبھی اس کو اکیلے میں نہیں ملی۔ وہ راستہ سے آتے جاتے سلک ہاؤس کے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا اُسے تاکا کرتا۔ مگر ڈی سوزا چپ چاپ یوں گردن جھکائے گزر جاتی جیسے چلتے چلتے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہی نہیں ہوئی ہوں۔

کچھ بے اختیاری کے عالم میں اس کے پاؤں آپ ہی آپ کمرے سے باہر کی سمت اُٹھ گئے۔

باہر کی دنیا بے حد خوبصورت ہو رہی تھی۔ حد درجہ جوان، ابھی چند گھنٹے پہلے سیاہ گھٹاؤں کا سمندر اُمڈ رہا تھا۔ جس کے باعث ساری فضا وقت سے پہلے تاریک ہونے لگی تھی۔ ایسی تاریک کہ اسے دفتر کی تین تین بڑی کھڑکیوں والے کمرے میں روشنی جلانی پڑی تھی۔ مگر ذرا دیر بعد یہ گھٹا اچھی طرح برسے بغیر ہی نامعلوم سفر کو چل پڑی تھی —— ایسے ہی —— ایسے ہی —— ڈی سوزا کے چھوٹے سے خوش گوار سماں کے سبب قدرے لاپروا دماغ کو کوئی استعارہ نہیں سوجھا، تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ایک عجیب خجالت آمیز ہنسی۔ کچھ پر کیف جھینپ سی جیسے اس کے

دل میں ارمانوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا ہے۔ ذرا دیر کے لئے..... مگر وہ سوچتے سوچتے افسردہ ہوگئی۔ ذرا ہی دیر کے لئے تو پھر تو اس کے دل کا وسیع آسمان کیسا سونا پڑ جاتا ہے۔ یہ امڈتے بادل برسے بغیر پتہ نہیں کدھر چلے جاتے ہیں.....!

مگر آج تو ذرا بارش بھی ہوئی ہے۔ اور آنکھ بچا کر بھاگے ہوئے مسافر چپکے سے اپنا قرضہ چکا بھی چکے ہیں کہ کسی کو خبر ہے تو کسی کو نہیں ——— ڈی سوزا خوش ہوگئی۔ سامنے آسمان پر اس کونے سے اس کونے تک سات رنگوں والی دھنک، اس کی خوشیوں کا رنگین جھولا ابھر آیا تھا تعجب — حیرت ———!

اس نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''تم کہاں رہتی ہو۔ کہاں چھپی رہتی ہو ———؟''

پتہ نہیں کون بول رہا تھا کس کی آواز تھی۔ ڈی سوزا کو یوں لگا گویا وہ ایک نہیں ہے۔ اس کے دو وجود ہیں۔ ایک کھردرا سخت اور کسی قدر بے ڈھنگا۔ تو دوسرا بڑا نرم، بہت نازک، بے حد ملائم، ریشم کی طرح، عجیب عادت ہے اس کی۔ کچھ پوچھے بغیر تو رہتا ہی نہیں۔ مچل پڑتا ہے۔ کہاں چھپی رہتی ہو میری خوش رنگ دھنک ———؟''

ڈی سوزا نے سوچا، جیسے وہ بڑا آسمان ہے۔ جس پر ہر دم لوگوں کی غرضوں اور ضرورتوں کی کالی کالی بھدی بھینسیں یہاں سے وہاں تیرتی رہتی ہیں۔ کچھ اس طرح کہ اس کا وجود ہی ڈھک جاتا ہے۔ ایک دم سے چھپ جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ بادل چھٹ جاتے ہیں۔ اور ——— اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ دل نواز رنگوں والی دھنک کہیں سے نہایت آہستہ روی سے، چپکے سے ابھر آتی ہے۔ پیارے پیارے رنگ ——— نیلے نیلے ——— سرخ ——— سبز ———

اس کے سامنے رنگ برنگے کپڑوں کے تھان بکھرے پڑے تھے۔ ذرا ہوش کی دنیا میں لوٹی تو ڈی سوزا اپنے آپ کو سلک ہاؤس میں پا کر متعجب ہوئی۔ سامنے کاؤنٹر میز پر رنگ برنگ کے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ ڈھیروں خوش رنگ کپڑے — ایک گورے رنگ کی بنگالی لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی۔ دولہن سی — اس کی مانگ میں یہاں سے وہاں تک سیندور جھلملا رہا تھا۔ جیسے زندگی کے سارے ارمان پورے ہو رہے ہوں۔ ساڑی کا آنچل سر پر جما ہوا تھا۔ جس کے ایک کونے کو اس نے دانتوں

سے دبا رکھا تھا۔ بار بار وہ نظریں اٹھا کر اپنے شوہر سے کچھ کہتی۔ ہر بار اپنے شوہر کی شریر نگاہوں اور معنی خیز مسکراہٹوں سے شرما کر نظریں جھکا لیتی۔ اس وقت اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور آنکھیں یوں مست ہو جاتیں گویا اب نشہ بکھیرنے لگیں گی۔ ڈی سوزا کو یہ جوڑا اتنا اچھا لگا، خصوصاً یہ لڑکی جو دولہن تھی شاید، اتنی پیاری لگی کہ وہ اس کی ذات میں محو ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ خود دولہن بنی اپنے شوہر کے ساتھ سلک ہاؤس میں مسکرا مسکرا کر اور شرما شرما کر کپڑے خرید رہی ہے۔ اس کا سارا وجود موم کی طرح سبک ہو گیا۔ اور اس کے رگ و پے میں ہلکی ہلکی سنسناہٹیں پھیلنے لگیں۔

''آپ کو کیا چاہیے میڈم؟'' اس مدراسی نوجوان نے قدرے بے توجہی سے کہا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے ایک رومال چاہیے۔''

''میم صاحب کو رومال دکھاؤ۔'' اس نے پاس والے لڑکے سے یوں رکھائی سے کہا۔ گویا اتنے بڑے سلک ہاؤس میں چودہ آنے کا رومال خریدنے والا گاہک انتہائی بے بضاعت ہوتا ہے۔

ڈی سوزا کو تضحیک محسوس ہوئی۔ اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اس خوبصورت بنگالی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔

اسے پان والے کے شیشے میں دکھائی دینے والا بدصورت، چیچک بھرا، اجنبی چہرہ یاد آیا۔ ——— دفعتاً اسے اپنی بے بضاعتی کا بڑا شدید احساس ہوا۔ وہ جھلائی الجھی ——— اس کی آنکھوں میں آنسوں آ گئے۔ پھر وہ رومال لئے بغیر پاؤں پٹکتی شوروم سے باہر نکل گئی۔

باہر کی دنیا حسب حال ویسے ہی تھی۔ صاف ستھری، دھلی دُھلائی سی، خوبصورت سی، مگر ——— مگر کیا چند منٹ کی معمولی بارش، اس برسوں کی بدصورت دنیا کے چہرے کی میل دھو سکتی ہے؟ اسے یوں لگا، جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سلک ہاؤس، یہ خوبصورت بنگالی لڑکی جو دولہن بنی بات بات پر اندر ہی اندر مسکرا پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بظاہر خوبصورت اور صاف ستھری نظر آنے والی دنیا سب ایک حسین جھوٹ تلے چھپی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی موٹی بھدّی انتہائی مکروہ ٹانگ لجلجا رہی ہے۔ جس پر ڈی سوزا جیسی بدنصیب لڑکی جھکی، بوند بوند کر کے ارمانوں کے لہو ٹپکا رہی ہے۔

اسے اپنے اس استعارہ کو سوچ کر قدرے اطمینان سا ہوا۔ ایک جھلاہٹ جو اس کے اعصاب پر بدرنگ کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ وہیں کہیں دب گئی۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو اس کی زلفوں کو چھیڑ کر گزر گیا۔ پھر دوسرا شوخ اس کے رخسار کو چومنے لگا۔ مگر اسے یوں محسوس ہوا گویا اسے گھر پہنچنا ضروری ہے۔ اور صبح و شام کا ازلی اور ابدی چکر اسے پکار رہا ہے۔

''بے بی زندگی مانگے کی روشنی ہے۔ اسے یوں ضائع مت کرو——''

ڈی سوزا گھر لوٹ رہی تھی تو اس نے دیکھا۔ بیکس کینٹین کے باہر کھڑی روزی بار بار رابرٹ کے کمرے کی سمت دیکھ رہی ہے۔ نفرت سے اس کا جی بھر آیا کہ آگے بڑھ کر روزی کو ایک بھرپور طمانچہ لگائے۔ بدذات، ذلیل لڑکی، کیا اتنی بڑی دنیا میں تجھے اور کوئی کام نہیں۔؟

مگر ڈی سوزا رک گئی۔ کیا خود اسے اتنی بڑی دنیا میں کاموں کی کمی نظر آتی ہے؟ اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ پھر مڑ گئی۔ برسات کی اودی اودی رات بڑی تاریک تھی۔ بیکس کینٹین کی مدھم روشنی بڑی مدھم تھی۔ بیماری، کسی انسانی دل کی طرح مدقوق۔ پھر اس کی نگاہ رابرٹ کی کھڑکی کی طرف گئی۔ وہاں بھی روشنی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر رابرٹ کو ڈھونڈنے لگیں۔ اس نے جھانک کر اس کے کمرے میں دیکھا۔ رابرٹ اپنی رنگین بش شرٹ اور اونچی پتلون سمیت چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔

''رابرٹ——!''

''رابرٹ سو گئے کیا——؟''

رابرٹ اٹھ کھڑا ہوا——یس سسٹر—— نہیں نہیں سویا——!'' پھر اس کے چہرے کی مسکینی رو پڑی۔

ڈی سوزا نے اس کی طرف دیکھا۔ اور یکا یک اس نے محسوس کیا، گویا اس کا دل اچھل کر حلق تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے پرس سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ رابرٹ کی طرف پھینک کر تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

''وقت کتنا وسیع آسمان ہے''—— ڈی سوزا نے ماں کی گود کی طرح عافیت دینے والی

چارپائی پر لیٹتے ہوئے سوچا،—— ''وقت کتنا وسیع آسمان ہے جس پر ارمانوں کا پیاسا پرندہ پانیوں سے تھل تھل بھرے ہوئے سیاہ بادل کے گرد محوِ پرواز ہے۔ بے معنی، فضول، لاحاصل——''

سامنے ٹائیلٹ میز پر خداوند یسوع حسب دستور مسکرا رہا تھا۔ ڈی سوزا کا دل رو پڑا——خداوند، تو گواہ ہے——تو گواہ ہے——میں کچھ نہیں جانتی——کچھ بھی نہیں——میں بھی تو ایک بدصورت سیاہ صلیب برسوں سے جھول رہی ہوں، بے گناہ، بے خطا۔

OO

پیاسی چڑیا

آفتاب کب کا غروب ہو چکا تھا۔ اندھیاری جھک آئی للی واٹسن کی جب آنکھ کھلی تو سامنے والے املی کے گھنے پیڑ کی آغوش میں چڑیوں کا شور بیدار ہو چکا ہوتا تب ہوا کوئی تیز، مغرور جھونکا اٹھلاتا ہوا آتا اور اس کی کھڑکی کے خوبصورت پردوں کو چھیڑ کر اس کے چہرے کو چومتا گزر جاتا۔ پھر مس للی واٹسن جو گذشتہ رات کی مصروفیت کو بھولے ہوئے ہوتی۔ املی کے گھنے پیڑ پر اپنی نگاہیں گاڑ دیتی اور سماعت کے پنجرے کا صدر دروازہ کھول دیتی۔ جہاں دن بھر کی تھکی ہاری چڑیوں کی لگاتار مسلسل ''چوں، چاں'' ہوتی اور پرندے ایک ایک کر کے صدر دروازے سے داخل ہوتے اور پناہ گیر ہوتے۔ رفتہ رفتہ چڑیوں کا شور املی کے منحوس پیڑ سے لپٹ کر سو جاتا۔ تب نیند میں ڈوبی ہوئی مس للی واٹسن کی آنکھیں دیکھتیں کہ اندھیاری جھک آئی اور اس کی ماں مسز واٹسن جو رات کا انتظار سپیدۂ سحر کے نمودار ہوتے ہی کرتی رہتی ہے۔ ابھی نہیں آئی ہے اور وہ کسل مندی سے بڑی میٹھی، لطف کسل مندی سے کروٹ بدلتے بدلتے ایک دم سے اوندھی ہو جاتی اور اپنے نازک شاخ گل کی طرح کے جسم کو نرم توشک کے سمندر میں غرق کر چکی ہوتی اور قدرے غنودگی کے عالم میں اپنے سینے، سڈول خوبصورت نئے نئے کبوتروں کی طرح کے سینوں پر قدرے بوجھ دے کر فرش پر اپنی انگلیاں ٹکا دیتی اور چاہتی کہ کوئی اس کے جسم پر آہستہ آہستہ دباؤ ڈالے۔ پھر وہ اپنے تصورات میں اپنے خوبصورت گداز جسم کو ایک دم ننگا کر کے دیکھتی اور ایک ذرا غرور، ایک ذرا مسرت سے اس کے لبوں پر مسکراہٹ آتی۔ ''ریلی آئی ایم ٹو ریچ۔''

تب ہی کمرے میں اس کی ممی داخل ہوتی اور ایک ذرا مجرمانہ اندازۂ نگاہ لئے اس کا جائزہ لیتی اور ایک عجیب سی ہنسی ہنس کر اسے یوں بیدار کرتی گویا وہ جانتی ہی نہیں کہ للی کی رات کی مصروفیات کیا ہیں اور وہ ہر شام بن سنور کے پچھلے دروازے سے کہاں جاتی ہے۔ اس کی ممی

پیاری اور بے چاری ممی، ذرا سی مکار، ذرا سی خود غرض، ذرا سی کام چور، پھر للی کو مس جوزیفائن یاد آئی جو اس کی طرف بڑی مہربان نگاہوں سے دیکھتی ہے اور شفقت سے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے۔ اور سرگوشیانہ لب و لہجے میں بولتی ہے کہ ''تمہاری ممی ہے ڈارلنگ.....!!

پھر وہ چپ ہو جاتی اور اپنے میلے پھٹے ہوئے بدرنگ سنڈل کے پنجے کو دائیں بائیں گھما کر اپنے داہنے ہاتھ سے پرانے پتلے ٹاٹ کے بنے ہوئے خوبصورت جھولوں میں سے ایک کو سامنے کر کے دکھ سے ہنستی ہے اور بھولپن سے کہتی ہے۔ ''یہ جھولا تمہیں پسند ہے.....؟''

پھر یہ سن کر للی اسے جواب طلب گہری نگاہوں سے گھورتی ہے۔ تو پھر وہ دوسرا جھولا، پھر تیسرا جھولا، پھر چوتھا جھولا اس کے سامنے کرتی جاتی ہے اور پوچھتی جاتی ہے —— ''یہ پسند ہے..... یہ پسند ہے..... یہ..... پسند ہے۔''

پھر للی واٹسن جو خود محسوس کرتی ہے کہ قدرے تیز مزاج کی ہے۔ اس پر غصہ نہیں ہوتی اور آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ہے اور گردن جھکا کر پُر اعتماد لہجے میں کہتی کہ مجھے..... نہیں، نہیں..... یہ بھی نہیں!

پھر جوزیفائن بناوٹی خفگی سے پوچھتی ہے۔ ''پھر کیا چاہتی ہو؟''

پھر وہ یعنی للی واٹسن جس کی نگاہوں کے سامنے کبھی کبھی کوئی سیاہ، گہرا سیاہ بادل لہرا کر گزر جاتا ہے۔ بڑی ہمت کر کے کہتی ہے۔ میں مسز جوزیفائن وہ چاہتی ہوں جو تم کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہیں پاتیں.....''

تب یکا یک مسز جوزیفائن کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے اور لگاتار ہنسے جاتی ہے ''بائی گاڈ بے بی، یہی ایک جھوٹ بات ہے۔ یہی ایک جھوٹ.....''

''کیا؟'' للی اس کے بازو کو پکڑتی ہے اور ذرا خفگی سے بولتی ہے۔ ''کیا جھوٹ ہے؟''

''یہی کہ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میری پیاری سی گڑیا بے بی، ذرا سی مغرور ذرا سی تنک مزاج مگر ذرا اچھی سی للی واٹسن بھی وہ سب سننا چاہتی ہے.....''

پھر مسز جوزیفائن اپنے سارے جھولے اپنے ناتواں کندھے پر رکھتے ہوئے اس کے کان کے قریب اپنا منہ لے کر سرگوشی سے کہتی —— ''ذرا سی ہمت کرو، ذرا سی، پھر یہ بوڑھی خستہ حال مسز جوزیفائن کچھ نہیں پوچھے گی اور نہ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہی پڑے گی۔ کیونکہ

پانی ڈھلان ہی کی طرف بہتا ہے۔ مائی سوئٹی۔"

تب ایک روز وہ اپنی سب کچھ جاننے والی انجانی ماں سے لپٹ کر پوچھ بیٹھتی ہے کہ۔

"ممی ڈارلنگ تم جانتی ہو۔ میں ہر شام کہاں جاتی ہوں؟"

جواب میں ممی ڈارلنگ گناہگار بے گناہوں کی طرح گردن جھکا دیتی ہے اور کچھ نہیں بولتی۔ اپنے انگوٹھے سے کچے فرش پر فرضی لکیریں کھینچنے لگتی ہے۔

پھر اس کی بے زبان ماں کی خاموش گویائی میں ایک پُرشور قہقہہ امڈتا ہے اور امڈتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک تیز گرم اور ناقابلِ برداشت بگولے کی طرح ——— اور اس کی چھاتی پیاس سے پھٹی پڑتی ہے۔ گلے میں یہاں سے وہاں تک ریگستان سلگنے لگا ہے ——— اور لب.....

اس نے کہا "ممی میرے لب سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ مجھے ذرا پانی دو ذرا سا پانی ——؟"

اور جواب میں اس کی ماں پھر وہی پرشور ننگی ہنسی ہنستی ہے اور تڑپتی ہوئی سیال آگ والا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے اور اس کے جسم سے ایک اور کپڑا الگ کر کے اسے اجنبی مدہوش سیٹھ کی آغوش میں ڈھکیل دیتی ہے اور یوں جب وہ ایک دم سے الف ننگی ہو جاتی ہے تو ہنستے ہوئے وہ اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے اور لپک کر کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیتی ہے۔ اور جب، جب وہ اندر چیختی ہے اس کی ممی تب، تب باہر سے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتی ہے اور زور زور سے قہقہہ لگاتی ہے جیسے بوالہوس گندا گدھ کسی لاش کے آس پاس پھڑ پھڑا رہا ہو۔

اس دن اس کی پیاری ممی نے اس ادھیڑ عمر کے شراب میں مدہوش روتے ہوئے سیٹھ کو دیکھ کر کہا تھا۔ "بے بی ڈارلنگ، جانتی ہو، یہ بہت دکھی انسان ہے۔ یہ تمہارے پپا کا دوست ہے۔ اس کا جوان لڑکا موٹر کار کے حادثے میں فوت ہو گیا ہے۔ آج اس غریب پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ بے بی پیاری تم ذرا اس کا غم دور نہیں کر سکتیں۔

"بے بی ڈارلنگ، دھڑکتے ہوئے دلوں پر ہاتھ رکھو۔ پیاسے حلقوں میں ٹھنڈے پانی کا قطرہ ٹپکاؤ۔ یہی یسوع مسیح نے کہا ہے۔ دھڑکتے ہوئے دلوں پر ہاتھ رکھو..... یہی یسوع مسیح نے کہا ہے۔"

"ممی تم جانتی ہو۔ اس دن مجھے بھی بہت پیاس لگی تھی اور تم نے ٹھنڈے پانی کے قطرے کی بجائے میرے گلے میں جہنم کی آگ انڈیل دی تھی....." پھر مس للی واٹسن کھلکھلا

کر ہنس پڑتی ہے اور سامنے پڑی ہوئی چائے کی پیالی کو ٹھوکر سے اُڑا کر آگے بڑھ جاتی ہے اور کندھے اُچکا کر لاپروائی سے کہتی ہے —— ''جب سے ممی مجھے پیاس ہی نہیں لگتی .... پیاس ہی نہیں لگتی .... !''

پھر گہرا سیاہ بادل جو اس کی زندگی کے آگے آگے کھولتے ہوئے سمندر کی طرح سنسناتا رہتا چھٹ جاتا۔ ساری کالونی میں یہاں سے وہاں تک لیمپ پوسٹ روشن ہو جاتے اور مسز جوزیفائن کے کمرے سے وائلن پر ''او مائی ڈارلنگ'' کی دھن تنے ہوئے تار پرنٹوں کی طرح پھیلنے لگتی اور ساری فضا، سارا ماحول سارا عالم خوبصورت نائلون میں ملبوس جھلکتا چمکتا اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا اور جب ہی اس کی ماں خوشی سے تقریباً اچھلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی اور اسے ٹائیلٹ میز سے اٹھاتے ہوئے کہتی کہ کار آ گئی ہے، کار آ گئی ہے ——
پھر وہ ذرا تیزی سے ذرا لاپروائی سے پیچھے مڑ کر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے سیڑھیاں طے کر کے پچھلے دروازے سے کار کی طرف لپکتی اور مسز جوزیفائن کے وائلن کی دھن اس کے تعاقب میں لرزتی لرزتی کار تک آتے آتے ہواؤں میں کھو جاتی، گم ہو جاتی، پھر کار ڈرائیور کبھی موٹا بھاری بھرکم، عمر دراز، کبھی دُبلا پتلا نوعمر، کبھی سیاہ پگڑی اور سرخ بش شرٹ والا سردار کبھی کوئی خاکی وردی میں ملبوس ڈرائیور ہڑبڑا کر باہر نکلتا اور نہایت ادب سے دروازہ کھول دیتا اور وہ لپک کر کار کے گدّے پر یوں اچھل کر بیٹھتی، جیسے ہلکے نرم اور سفید بادلوں کی گود میں گر پڑی ہو۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا، جب وہ نوجوان گہری گہری سیاہ آنکھوں والا مسلمان ڈرائیور ہوتا، جو لاپروائی سے پان کھاتا رہتا۔ اور اس کے اس انتظار پر کہ لپک کر اٹھو اور ادب سے نظریں جھکائے دروازہ کھولو کی بجائے گردن گھما کر پان کی پیک باہر پھینکتا اور پلٹ کر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتا کہ وہ خلاف عادت، خلاف دستور خود دروازہ کھولتی اور چپکے سے گدّے پر یوں اپنا وجود رکھ دیتی جیسے اس کا اپنا آپ اپنا نہ ہو بلکہ چوری کا ہو۔ تب للّی واٹسن جو کسی سے نہیں ڈرتی اور اچھے اچھوں کو ناکوں چنا چبوا چکی ہے جو شہر کے بڑے بڑے رئیسوں اور افسروں سے پاؤں دبوا چکی ہے، محسوس کرتی کہ اس پان خور مسلمان ڈرائیور کی آنکھوں میں گہری گہری، سپاہیوں کی طرح چوکس، خنجر کی طرح اٹھی ہوئی نگاہوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہے، جو انوکھی ہے۔ ذرا ڈراؤنی، ذرا جا ..... ک ..... جس کو دیکھتے ہی کوئی شے اس کے احساسات پر سرسرانے لگتی

ہے.....اور یہ سرسراہٹ ساری رات طاری رہتی۔ وہ جب جاز کے مست کن رقص کر رہی ہوتی کسی مال دار سینھ کے ساتھ ڈرنک کر رہی ہوتی۔ یا پھر اچانک کسی بات پر زوردار قہقہہ لگا رہی ہوتی۔ وہ خنجر سی اٹھی ہوئی نگاہ اچانک کہیں سے اس کے سر پر جھولنے لگتی اور دفعتاً اس کا نازک سا گناہوں کے سمندر میں کنول سا بے گناہ دل اچھل کر اس کے حلق تک آجاتا اور وہ تڑپ جاتی۔ تب کوئی خریدار اپنے دام وصول کرنے کی غرض سے اسے اپنی طرف کھینچنے لگتا تو وہ ڈری ڈری سی کانپ سی جاتی۔ پھر وہ خریدار اپنے سینے سے چمٹا کر اس کی ٹھڈی اٹھا کر، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وجہ پوچھ بیٹھتا تو وہ جھلا کر رہ جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ جس آدمی کی عجیب سی نگاہوں سے وہ سہمی رہتی ہے وہ اسے معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہے اور وہ اپنی سنڈل کی نوک پر بڑے بڑے افسروں کو رکھتی ہے۔ پھر وہ پلنگ پر ننگ دھڑنگ لیٹی اپنے بوائے فرینڈ کے منہ پر لات رسید کرتی اور فرش پر تھوک کر چٹواتی اور گھنٹوں پاؤں دبواتی رہتی اور گولڈن ایگل کے پیگ پر پیگ چڑھاتی اپنے کو بے سدھ کر دیتی۔ پھر کوئی اس کے جسم کو لاکھ نوچتا بھنبھوڑتا، اسے خبر نہ ہوتی۔

پھر رات کے تیسرے پہر اس کا بوائے فرینڈ زبردستی اٹھا کر کھڑا کر دیتا اور وہ باتھ روم میں واپس آتی۔ اور گولڈن ایگل کی تیز جھاگ سطح پر بیٹھ چکی ہوتی تو وہ اپنے آپ کو قدرے ہلکا محسوس کرتی اور ذرا غرور، ذرا تمکنت سے چلتی ہوئی اور کار میں سوئے ہوئے بدمعاش پان خور ڈرائیور کو چیخ کر اٹھاتی۔ اور اپنے رات بھر کے حاصل کئے ہوئے فرینڈ کی طرف غرور سے تکتی اور پان خور مسلمان ڈرائیور ہڑبڑا کر اٹھتا اور اپنے آقا کو سامنے پا کر ذرا گھبرایا گھبرایا مودبانہ سلام کرتا اور آگے بڑھ کر مس للی واٹسن کے لئے دروازہ کھول دیتا اور اپنے آقا کے اشارے پر گاڑی اسٹارٹ کر کے للی کو لے کر روانہ ہو جاتا۔

تب مس للی واٹسن، جس کے بھورے خشک بال پچھلے پہر کی تند ہواؤں کے باعث جھنڈیوں کی طرح پھڑ پھڑا رہے ہوتے۔ مسکراتی اور سامنے لگے گلاس میں جھانک کر دیکھتی، جس میں اس کا خوب صورت معصوم چہرہ تھرتھرا رہا ہوتا۔ پھر دفعتاً اسے یاد آتا اسی مغرور بے ڈھنگے ڈرائیور نے ایک روز اس سے تمسخر کے انداز میں کہا تھا کہ میم صاحب، ہمارے پاس ایک بلی ہوتا۔ بہوت موصوم صورت.....ایک دم آپ کا جیسا!

''کیا بولا؟'' وہ گرجی تو جلدی سے ڈھٹائی سے بولتا۔

''ایک دم آپ کا ماپھک مگر وہ سالی چوہا بہوت کھاتا ہے۔ بہوت.....!''

پھر وہ سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنے کے احساس کو اپنے اوپر طاری کئے گرج کر کہتی۔

''شٹ اَپ!''

''شٹ اَپ کا مطلب ہم نہیں سمجھتا۔'' وہ لچا بولتا اور اچانک کار کی رفتار دوگنی کر دیتا۔

پھر وہ تیز رفتار کار کے بند شیشوں سے دیکھتی کہ شہر کے جنوبی راستے کا آخری موڑ ختم ہو چکا ہے۔ پھر کار لمبی تنگ اور بدصورت گلی کی گندی دنیا میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر کھلا میدان آتا۔ برگد کا پرانا درخت آتا۔ جس کا پکا چبوترہ اس کی جڑوں کے پھیلنے بڑھنے کے باعث جہاں تہاں سے تڑخ گیا تھا۔ پھر درخت کے قریب والے گڈھے کے بجبجاتے ہوئے پانی کا چھینٹا اڑاتی ہوئی کار ایک تکلیف دہ جھٹکے سے رک جاتی۔ وہ بغیر منہ سے کچھ بولے اُٹھ کھڑی ہوتی اور مسلمان ڈرائیور ڈبے سے پان نکال کر اطمینان سے منہ میں رکھتا اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی پھر بغیر ایک لمحہ توقف کئے پیچھے مڑے تیز تیز چلتی ہوئی اپنے گھر کے ویران اندھیرے میں یوں غرق ہو جاتی کہ اگر رکی تو اس کی پیٹھ پر کوئی تیز سی چابک شڑاپ سے پڑے گی۔

پھر کمرے کے مدھم بیمار بلب کی زرد روشنی میں بڑے سے دریچے کے قریب سوئے ہوئے مائیکل کو دیکھتی، جو ابھی دنیا کے کسی غم سے واقف نہیں۔ جو غفلت کی نیند میں ڈوبا پتہ نہیں کس خواب زار کی سیر کر رہا ہوگا اور یہ سوچ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی کہ اس کے چھوٹے سے بھولے بھالے بھائی کی ایک گرل فرینڈ بھی ہے۔ سچی گرل فرینڈ جو اگرچہ مائیکل سے کئی سال بڑی ہے مگر پھر بھی مائیکل کے خوابوں کو آراستہ کئے رہتی ہے..... پھر دفعتاً کہیں سے تنہائی کا شدید، شدید ترین احساس اس پر طاری ہو جاتا اور وہ محسوس کرتی کہ وہ جس جگہ کھڑی ہے وہ دراصل بڑا گھنا جنگل بڑا گہرا تاریک سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں والا جنگل ہے — پھر وہ پلٹ کر دیکھتی تو سارا کمرہ ویران دکھتا، مائیکل گہری نیند میں سویا رہتا، مدھم بلب کی بیمار روشنی میں ایک آوارہ پتنگا منڈلا رہا ہوتا اور تب اسے لگتا کہ وہ آدم آدم زاد نہیں، کوئی املی کا بڑا گھنا، گھنا درخت ہے۔ اور گزشتہ رات بھر کے سارے ہنگامے جو ہو چکے ہیں وہ دراصل خود غرضیوں کے پرند ہیں جن کی لگاتار مسلسل چوں چاں کی آوازیں اس کے وجود سے لپٹ کر سو جاتی ہیں اور..... اور..... وہ ڈراؤنے تن تنہا پیڑ کی طرح اپنے احساسات کو پنپواتی رہتی ہے تب ایک ذرا شک ایک ذرا حسد

بھری نگاہوں سے وہ اپنے چھوٹے بھائی مائیکل کو دیکھتی جو خبر نہیں سکون کے کس بلند آسمان پر محو پرواز ہوتا..... پھر اسے یاد آتا کہ ادھر کچھ دنوں سے اس کے چھوٹے بھائی مائیکل کی آنکھوں میں کوئی سوال مسلسل سلگتا رہتا ہے اس کی بھوری معصوم آنکھیں کبھی کبھی سوال میں بدل جاتی ہیں اور چلتے چلتے اس کے دل کے دامن کو تھام لیتی ہیں۔

کیا مائیکل وہی سب جاننا چاہتا ہے۔ پھر وہ فرط محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی اور جھک کر آہستہ سے اس کی پیشانی چوم لیتی.....

(۲)

جب مسز جوزیفائن کے دروازے پر ہلکے سے تین چار بار دستک ہوئی تو وہ جو دیر سے پنکھے کی بجائے فرائی پین سے لوہے کے چھوٹے سے چولھے کا دھواں اڑانے میں مشغول تھی ایک ذرا گردن موڑ کر بھیگی آنکھوں سے اس نے دروازے کی طرف دیکھا، اور ''کم اِن'' بول کر پھر کوئلے کا دھواں اڑانے لگی۔ پھر جب ذرا دیر بعد دھواں اُڑ گیا اور شعلوں کی سرخ زبان تھرتھرانے لگی تو اس نے دیکھا کہ کمرے کی جنوبی دیوار سے لگی جو اجاڑ صورت لڑکی کھڑی ہے وہ کوئی اور نہیں ہے للی واٹسن ہے۔ جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور کسی کی پروا نہیں کرتی۔

''مائی سوئٹی..... مائی ڈارلنگ..... آؤ آؤ میرے قریب بیٹھو۔''

اور جب مس للی اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی تو وہ ذرا کی ذرا آنے کی معذرت کر کے چولھے کے پاس گئی اور ایک پانی سے بھری ہوئی کیتلی چولھے پر چڑھا کر واپس آئی اور للی کی پیشانی چوم کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''تمہیں پتہ ہے بے بی تم تین دن کے بعد کالونی لوٹی ہو۔ اور ان تین دنوں میں جانتی ہو کیا خاک اڑ رہی ہے؟ کیا ہنگامے ہوئے ہیں؟؟ تمہاری ممی جو تمہیں سونے کی چڑیا سمجھتی ہے۔ بیسیوں بار بیہوش ہوئی ہے اور پاگلوں کی طرح کالونی کی نالیوں اور گندگی کے ٹب میں تمہیں ڈھونڈتی پھری ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کی للی بیٹی ایسی ہی جگہ کھوئی ہے۔''

پھر للی کی خاموش اجاڑ صورت، تباہ حال دیکھ کر مسز جوزیفائن چپ ہو جاتی ہے اور بڑی سرگوشیوں میں پیار سے کہتی ہے۔ ''کین آئی ہلپ یو ڈارلنگ؟''

''نو مسز جوزیفائن، تھینک یو..... کیونکہ میں بذات خود.....؟'' پھر للی واٹسن

نے چائے کی ایک پیالی پیتے ہوئے بتایا کہ اس پان خور مسلمان ڈرائیور نے حسب دستور تمکنت سے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ چپ چاپ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار ٹیڑھے میڑھے راستوں کو طے کر کے ایک جھٹکے سے صدر راستے پر آ چکی تو اس نے آہستہ سے متین لہجے میں کہا۔

آج ہم تمہارا سیٹھ کے یہاں نہیں جائے گا.....''

''ڈرائیور نے پلٹ کر ایک نظر دیکھا اور قبل اس کے کہ وہ کوئی سوال کرے، للی نے طمانیت سے جواب دیا۔ ''آج ہم تمہارا گھر جائے گا—؟''

دفعتاً کار کو زور سے بریک لگی اور مس للی واٹسن اگلی سیٹ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ڈرائیور نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے اس نے لرزتی ہوئی آواز سے رُک رُک کر کہا۔

''مگر.....مگر ہمارے پاس پیسہ نہیں!''

''پھر میں مسز جوزیفائن بہت زور سے قہقہہ لگا کر ہنسی۔ کیونکہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ سچائی جو کچھ دکھائی دیتی ہے وہی نہیں ہے بلکہ اس سچائی کے نیچے ایک حقیقت ہے جو بڑی کھری ہے!''

مسز جوزیفائن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور اس نے استعجاب سے چھوٹی سی کمزور سی کم عمر للی کو یوں دیکھا گویا وہ کسی بڑے اونچے قوی ہیکل پہاڑ کے قریب کھڑی ہے۔ پھر اس نے پلنگ کی چادر درست کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بے بی، میں سمجھی نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟

میں بھی نہیں سمجھ پائی تھی مسز جوزیفائن کیونکہ میں نے بھی اس سے پہلے کبھی وہ منظر نہیں دیکھا تھا ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ کہ جب بیچ دار گلیوں اور چھوٹے چھوٹے کھپر پوش مکانوں والے محلے سے گزرتی ہوئی کار ایک بے حد تنگ، بے حد غلیظ گلی کے موڑ پر رکی تو بدبو کا ایک بھپکا اس کی ناک میں گھس گیا جس کے باعث اس کے احساسات میں گندگی پھیل گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اس کا بازو پکڑ کر جلدی جلدی دو تین چھوٹی بڑی گلیوں کو طے کر کے ایک ٹاٹ کا پردہ لگے دروازہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ذرا نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے یوں للی کو لئے دیئے پردے کے اندر غڑاپ سے گھس گیا۔ جیسے کوئی بھاری پتھر پانی کی سطح پر گر کر ڈوب جائے۔

برآمدے میں للی کو کھڑی کر کے وہ مسلمان ڈرائیور، جس کا نام عبدل تھا اندر کوٹھری میں

گیا۔ کسی سے سرگوشیوں میں باتیں کیں۔ پرانی لالٹین جو بھبک بھبک کر جلنے کے باعث دھواں اگل رہی تھی اس کی چمنی کو صاف کیا۔ بیچوں بیچ لگی ہوئی رسّی پر ایک میلی چادر ڈال کر کمرے کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ تب اس کا ہاتھ پکڑ کر چوروں کی طرح اسے اندر کمرے میں ایک جھیلنگ چارپائی پر بٹھا دیا اور ''ابھی ابھی آیا'' کہہ کر کمرے کے باہر نکل گیا۔

لالٹین کی مدھم سرخ روشنی میں للّی واٹسن نے دیکھا وہ چھوٹا سا کمرہ ہندوستانی فلم اسٹاروں کی کئی پھٹی تصویروں سے بے ڈھنگے پن سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اس میں سیلن ہے اور ایک عجیب طرح کی ناقابل برداشت بو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جب ہی کمرے کے دوسرے حصے سے کسی کمزور آدمی کے کراہنے کی آواز بھی آئی اور للّی دفعتاً گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے دل میں آیا کہ بھاگ جائے.....

لیکن اس نے اپنے دل کو ڈھارس دی اور بڑے حوصلے سے اور ہمت کر کے چادر کے اس طرف والے حصے کی طرف جھانک کر دیکھا، جہاں ایک چارپائی پر بے حد گندہ بستر بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک ہڈیوں کا ڈھچر پڑا ہوا ہے۔ یہ عبدل کی بیوی تھی جو بہت بیمار تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس کے سینے سے چمٹا ہوا ایک نحیف سا بچہ تھا، جو رہ رہ کر کلبلاتا تھا۔ اس کے پیروں سے لگے دو کم عمر بچے بے خبر سوئے ہوئے تھے۔

عبدل کی بیوی پانی مانگ رہی تھی۔

مس للّی واٹسن دنگ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ، وہ نہیں ہے کوئی اور ہے۔ چنانچہ للّی نے گردن ٹوٹی صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک نامعلوم جذبے کے زیر عبدل کی بیوی کی گردن میں اپنا بازو حمائل کر دیا اور ذرا سا زور دے کر اس کی گردن کو اٹھا کر گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا اور عبدل کی بیمار بیوی برسوں کی پیاسی چڑیا کی طرح غٹ غٹ پانی پینے لگی.....

''تب مسز جوزیفائن.....'' للّی نے اپنے آپ کو مسز جوزیفائن کے بستر پر ڈال دیا۔ ایک طویل جمائی لے کر آنکھیں بند کر لیں اور ایک ایسی دنیا میں چلی گئی جہاں دور دور تک تاحدِ نگاہ سبزہ زار ہی سبزہ زار تھا۔ وسیع سفید براق بادلوں میں ملبوس وسیع آسمان، محبت کی ناآسودہ لبوں کو چومتی ہوئی ہوائیں، دل اور دل کی مقدس دھڑکنیں، اور خدا..... اور خدا..... اور خدا.....!

''تب مسز جوزیفائن.....'' اس نے آنکھیں کھول دیں — ''میں نے یوں محسوس

کیا کہ یہ پانی جو گھونٹ گھونٹ کر کے عبدل کی بیماریوں کے خشک حلق میں دھاگے میں بچے موتی کی طرح اتر رہا ہے۔ اس سے دراصل میری اپنی پیاس بجھ رہی ہے۔......"

"دِلّی !۔۔" مسز جوزیفائن نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور لپک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"پھر، پھر کیا ہوا۔۔۔۔؟"

پھر عبدل کی بیوی نے کہا۔" میں کئی مہینے سے بیمار ہوں اور اسی حالت میں اپنا جسم نچواتی ہوں...... میرا شوہر مجھے کھانے کو دیتا ہے، کپڑے دیتا ہے اور سود خور بنئے کی طرح اس کی قیمت وصول کرنے میں ذرا دریغ نہیں کرتا میں لاکھ کہتی ہوں، میرے بدن میں، میرے جوڑ جوڑ میں درد ہے۔ میرا دل رہ رہ کر ڈوبنے لگتا ہے۔ مگر وہ نہیں مانتا، اس کی آنکھیں اس وقت اور بھی سرخ ہو اٹھتی ہیں۔۔ چڑھ جاتی ہیں۔ چہرہ تن جاتا ہے اور اس کے بازوؤں میں اور زور آجاتا ہے ......اور اس وقت میں سوچتی ہوں کہ دام تو ہر خریدار کو وصول کرنے کا حق ہے اور یہ سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں اور بعد ازاں کھرّی چارپائی پر یوں نڈھال ہو کر گر جاتی ہوں جیسے کسی کبوتر کو بڑی زور کا غلیل کا ڈھیلا لگا ہو اور ویران دھرتی پر پیاسا ہانپ رہا ہو۔۔۔ ہانپے جا رہا ہو......"

پھر لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ اس کی طرف دیکھتی ہے اور ذرا تعجب اور ذرا خوف سے بولتی ہے۔" تم کون ہو۔۔۔؟"

پھر مس للی وانسن بتاتی ہے کہ وہ کون ہے اور کیوں یہاں لائی گئی ہے۔ جسے سن کر عبدل کی بیوی اٹھ بیٹھتی ہے اور مدھم روشنی میں ڈوبتی ہوئی مگر تیز آنکھوں سے دیکھتی ہے اور اس کی پیشانی پر ملائمیت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتی ہے۔" تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم ایسی نہیں لگتیں۔۔۔ تم پیاسوں کو پانی......"

"اس نے للی کی ٹھڈی پکڑلی اور اس کا چہرہ روشنی کی طرف کرتے ہوئے بولی تم تو مجھے وہ لگتی ہو جو سات برس قبل اس کوٹھری میں لائی گئی تھی، شرمائی شرمائی سی تصورات میں کھوئی کھوئی سی، ذرا خوف زدہ، ذرا حوصلہ مند، ذرا سی مسکراتی ہوئی پچھلی زندگی کا غم اور آئندہ کے لہلہاتے مرغزار لئے......"

پھر مسز جوزیفائن، میں وہاں سے بھاگنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں غلط جگہ آ گئی

ہوں اور دفعتاً میری کئی برس کی سوئی ہوئی پیاس جاگنے لگی۔ یقیناً غلط جگہ ہے۔ کیونکہ یہاں عبدل کی بیوی جیسی عورت رہتی ہے جو سمجھتی ہے کہ وہ للی واٹسن جو اپنی خود غرض ماں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جگہ جگہ کنواں کھودتی رہتی ہے اور اس کی تہہ تک پہنچ کر آخری بوند بھی کھینچ لینا چاہتی ہے۔ بڑی نیک لڑکی ہے اور اپنے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے بھری صراحیاں لئے پھرتی ہے۔

پھر میں نے اس نادان کو بتایا کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ سمجھ رہی ہے میں ایک معمولی جسم فروش ہوں جس نے اپنے حالات کی یک رنگی، اپنے بھائی کی آنکھوں کے مسلسل سوال سے گھبرا کر فرار حاصل کیا ہے اور اب اس کے شوہر عبدل ڈرائیور کی آنکھوں میں جھولتی ہوئی خنجر کی تیز دھار کو دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے کہاں کہاں سے اور کس کس طرح قتل کرتی ہے۔

اس نے کہا ——— ''میں سمجھ نہیں پائی، تم کیا کہہ رہی ہو ———؟''

میں نے کہا ——— ''تم سمجھ بھی نہ پاؤ گی۔''

اور یہ کہہ جب میں جانے لگی تو اس نے لپک کر میرا دامن تھام لیا۔ ''نہیں نہیں آج مت جاؤ۔ آج میرا دل رہ رہ کر ڈوبنے لگتا ہے۔ مجھے آرام دو.....''

چنانچہ مس للی واٹسن نے تین دنوں تک اسے آرام دیا۔ اس کے شوہر کے آگے ایک کھلی ہوئی دری کی طرح بچھ گئی ——— اس کے تینوں چھوٹے چھوٹے بچوں کو نہلایا۔ اس کے کپڑے صاف کئے۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلایا اور اس کے کمرے کی سیلن اور برسوں کی گھٹن کو اپنی روح میں اتارتی رہی۔

اور اس کا شوہر شرمسار شرمسار نظر نیچی کئے للی کی پکی پکائی روٹیاں کھاتا، اور نگاہ جھکائے کپڑے تبدیل کرتا اور مجرموں کی طرح گردن جھکائے کمرے سے یوں نکل جاتا جیسے خود اس کی آنکھوں میں تنی ہوئی چابک للی کی آنکھوں میں آ گئی ہو۔

''پھر؟'' مسز جوزیفائن نے یوں کہا جیسے یہ سب خواب کی باتیں ہوں۔

''آج دوپہر میں، جب سورج ابھی سلگ رہا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی.....''

''ہائیں!''

''ہاں، مسز جوزیفائن ——— تینوں بچے چیختے چیختے رہے۔ اس کا شوہر سرہانے کھڑا روتا رہا اس کی آنکھیں میرے چہرے پر لگی رہیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں مجھے آرام دو۔ آرام دو.....

آرام دو.....''

اور میں نے پتہ نہیں کس بے اختیار جذبے کے تحت جھک کر گلاب کی دونوں پنکھڑیاں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں اور میری آنکھوں سے دو گرم گرم پانی کے قطرے تڑپ کر اس کے خشک، غم رسیدہ، رخساروں پر پھیل گئے.....

مسز جوزیفائن کے چھوٹے سے کمرے میں گہری خاموشی طاری ہوگئی ـــــ کئی منٹ گزر گئے۔ کئی صدیاں گزر گئیں۔ کیتلی کا سنسناتا ہوا پانی بھی چپ ہوگیا۔ نہ للی نے، نہ مسز جوزیفائن نے۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ دونوں گویا ایک تارعنکبوت پر چلتے چلتے رک گئی ہوں۔

مس للی واٹسن نے اپنی بکھری ہوئی زلف سمیٹ کر سنہری ہیئر پن سے یکجا کرتے ہوئے کہا۔

تب دفعتاً مسز جوزیفائن مجھے محسوس ہوا کہ میں جس کمرے میں ہوں وہ بہت گرم ہے۔ بہت تاریک ہے..... اور دفعتاً مجھے پیاس لگی اور میں آہستہ سے غیر ارادی طور پر کمرے سے نکل آئی۔ میں گلی گلی چلتی جاتی اور پیاس کی شدت سے میری چھاتی پھٹی جاتی تھی اور میرے قدموں میں چلنے کی طاقت سن ہوئی جارہی تھی۔ چنانچہ جب چاروں طرف سناٹا تھا۔ دھوپ سخت تھی اور ساری دنیا تنہائی اور شدید دھوپ میں سلگ رہی تھی۔، میں ایک مکان کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

سامنے میونسپلٹی کا نل سنسان پڑا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ لپک کر جائے اور نل کھول کر جی بھر کے پانی پیے، جی بھر کے، مگر اس کے قدم ہی نہیں اٹھے اور وہ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔

''تب مسز جوزیفائن میں نے کیا دیکھا کہ میں کیا بتاؤں، میں پیاس بھول گئی کیونکہ نل اچھی طرح سے بند نہ ہونے کے سبب ٹپک رہا تھا اور وہیں کتے کا ایک چھوٹا سا بچہ دونوں ٹانگیں اٹھا کر نل کی دیوار سے لگائے، چہرے کو اوپر کیے کھڑا تھا اور جیسے ہی نل سے ٹپک کر پانی کا قطرہ گرتا وہ پلا اپنا چھوٹا سا منہ کھول دیتا اور اس کے حلق میں اتر جاتا۔

پھر مس للی واٹسن خاموش دیکھتی رہی اور معصوم پلے کے منہ میں پانی اترتا رہا قطرہ قطرہ

..... قطرہ، جیسے دھاگے میں سچا موتی اتر رہا ہو۔ قطرہ قطرہ.....

جوہی کا پودا اور چاند

شہتوت کے گھنے درختوں میں پچھلے پہر کی بارش کے قطرے ابھی جھلملا رہے تھے۔ جب دیدی بستر سے اٹھی تھیں، ٹھنڈے فرش پر ان کے پاؤں شلوار کے پائینچے میں لپٹا گئے تھے۔ اور وہ ایک لمبے جھٹکے سے تیورا کر دروازے کے تختے سے جا لگی تھیں۔

اور میں اچانک اُچٹ جانے والی نیند کے باعث، باہم درختوں کے عقب میں پچھلے پہر کی بارش میں نہائے ہوئے زرد چاند کو مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ اڑا اڑا دھم کی آواز سے چونکی۔ میری توجہ ادھر بٹ گئی اور میں بے خیالی میں چیخنے والی تھی کہ کمرے کی مدھم روشنی میں دیدی کے لڑکھڑاتے ہوئے نڈھال سائے کو پہچان لیا۔

دیدی چوروں کی طرح دروازے کھول رہی تھیں۔ کہ چرا چرا ہٹ کی آواز نہ ہو۔ پر آواز تھی کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ پھر دروازہ کھول کر دیدی نے اسی احتیاط سے بند بھی کر دیا۔ اسی دم جانے کیسے میرے دل میں راز جوئی کی بات آئی۔ ایک عجیب سی گدگدی اور دھڑکن، جیسے میں چوری کرنے جا رہی ہوں۔

باہر دودھیا چاندنی میں جوہی کی سفید کلیاں یہاں سے وہاں تک بچھی پڑی تھیں اور خوشبو سے ساری فضا معطر ہو رہی تھی۔ وہ بیمار چاند جو گھنے درختوں کے پرے بڑا سا طباق لگ رہا تھا۔ کیسا بجھا بجھا تھا۔ گویا دیدی کا اداس چہرہ ہو۔

میری نگاہیں پچھلے پہر کی بارش میں نہائے ہوئے زرد چاند کی طرف اٹھ گئیں۔ پتہ نہیں کتنے مہینوں کے گہن کے بعد یہ چاند ابھرا ہے کہ زردی اس کے چہرے پر کھنڈ سی گئی ہے۔ اور اب کھلے آسمان میں یہ زرد چاند کیسا الگ الگ، اکیلا اکیلا سا لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں دیدی سے راہو اور

کتنے برس کا پرانا قرض وصول کیا ہے کہ اس کے بدن میں لہو کی بوند تک نہیں۔ پھیکے چہرے مسکراتی ہیں تو لگتا ہے دل کتنی تہہ در تہہ گہرائیوں سے ابھرا ہے۔ ہنستی ہیں تو پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل دھڑک اٹھتے ہیں۔ گویا دیدی نے بڑی گہری چیخ مار کر گریہ کیا ہو۔ ماں ان کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرتی ہیں۔ ''یوں کا ہے ہنستی ہو بھلی کہ میرے دل میں بگولہ سا اٹھنے لگتا ہے.....

'' دیدی کوئی جواب نہیں دیتیں۔ کچھ بولنے کی کوشش کرتی ہیں تو شاید کوئی بگولہ عفریتوں کا رقص کرتا اس کے حلق پر چھا جاتا ہے۔ اس دم میں نے محسوس کیا ہے کہ دیدی کی آنکھ کے گوشے میں کوئی سوال لرز رہا ہے..... دیدی تم..... تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ کہہ بھی چکو، کئی مہینے ہو گئے.....؟

'' کچھ بھی تو نہیں ننھی.....''

دیدی اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ اور کھڑکی سے لگ کر شدید دھوپ میں تپتے ہوئے ننھے ننھے جوہی کے پودوں کو تکنے لگتی ہیں۔ اس کڑی دھوپ میں ان ننھے ننھے پودوں پر کوئی سائبان نہیں۔ کوئی بادل کا ٹکڑا نہیں جو گھڑی بھر کے لئے ٹھہر کر ذرا ٹھنڈک پہنچا دے، چلو بھر پانی چھڑک دے..... اچھا ننھی یہ دھوپ کب تک رہے گی.....؟''

'' دیدی، میں کیا جانوں.....'' اور میں دیدی کی باتوں کے سمندر کنارے کھڑے کھڑے کلائی کی گھڑی دیکھ کر جواب دیتی ہوں..... ''شاید پانچ بجے تک، جب تک سورج نہ اتر جائے۔''

''اور یہ سورج کب اترے گا ننھی؟''

میں نہیں جانتی، میں تو اتنا جانتی ہوں کہ مالی کی بیوی لکھیا کے روپ کا سورج جب تک اترا نہیں تھا، کانا مالی اپنی ایک ہی آنکھ سے کسی ازل کے بھوکے راہو کی طرح اس کا روپ پی رہا تھا اور جب قرض اتر گیا۔ بلکہ بیاج بھی وصول ہو گیا تو کانا مالی شراب کے نشے میں دھت گلیارے گلیارے رات گئے تک مارا مارا پھرتا ہے..... اور لکھیا اس کی یادگار کے نام پر ایک مریل سا بچہ لئے دن بھر بخار میں بھنتی رہتی ہے۔ اور بچہ یوں روتا رہتا ہے۔ گویا کانے مالی کی موجودگی کا احساس کہیں کم نہ ہو جائے۔

ماں چیختی ہیں۔ ''جوہی کے پودے سوکھ رہے ہیں۔ کوئی پانی نہیں دیتا مالی پتہ نہیں کہاں

دن بھر بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ اور یہ حرام زادی کتے کے پلّے کو لئے پڑی رہتی ہے.....''

حرام زادی لکھیا کے بدن پر کوا کھانے کو ماس نہیں۔ وہ دس قدم چلتی ہے تو چکّر آجاتے ہیں..... باہر جوہی کے پودے پانی بغیر سوکھ رہے ہیں.....'' ماں چلا رہی ہیں اور اسے روپ کے چوروں کا بخار چھوڑتا نہیں..... میں کہتی ہوں..... دیدی تم نے روپ کے چوروں کا قصہ سنا ہے؟'' مگر دیدی میری بات سن کر پھر اس انداز سے ہنس دیتی ہیں جیسے رونے اور ہنسنے کا ڈھنگ بھول گئی ہوں۔

''نہیں ننھی ـــــ مگر میں راجہ کی کہانی جانتی ہوں جس نے سورگ کے لوبھ میں دھرتی کو چھوڑا تو اسے سورگ ملا نہ دھرتی..... میں بھی شیو شنکر کی طرح خلا میں معلق جھول رہی ہوں۔

مجھے یہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ دیدی کیا چاہتی ہیں۔ جب سے آئی ہیں لوگ آنکھوں میں بیٹھائے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانے کو دیتے ہیں۔ بھیا اپنی بیوی کی جیسی ساڑی نہیں لاتے اس سے اچھی دیدی کے لئے لاتے ہیں۔ سارے گھر میں بچے چلاتے رہتے ہیں مگر دیدی کے کمرے کے پاس پہنچ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ تاکہ دیدی کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ ماں نے بچوں کو مار مار کر سمجھایا ہے۔ کہ دیدی کو کوئی تنگ نہ کرے۔

''دیدی ـــ تمہیں تو یہاں سورگ سے بھی زیادہ آرام ملتا ہے۔؟''

میں جب دیدی سے اپنا مقابلہ کرتی ہوں تو مجھے رشک ہوتا ہے۔ مگر میری بات سن کر، دیدی اور بھی اداس ہو جاتی ہیں اور ان کی آنکھیں چھلک اٹھتی ہیں۔ ان کی منطق میرے دماغ میں نہیں سماتی۔

''یہی تو دکھ کی بات ہے ننھی، میں نہیں دیکھتی ہوں۔ ماں بھیا سے میرا ذکر کرتی ہیں تو آپ ہی اس کی آنکھیں بھر بھرا جاتی ہیں۔ دراصل ننھی سورگ کے ان دیوتاؤں نے مجھے قبول نہیں کیا ہے.....''

ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔ ہم نے تو دیدی کو اپنی آنکھوں میں جگہ دی تھی وہ تو دس برس کا معصوم نکو کبھی کبھی دیدی کی طرف دیکھ کر ماں سے پوچھ بیٹھتا ہے.....'' ماں جی یہ کون ہیں؟''

ماں جی اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہتی ہیں۔ 'یہ تیری پھوپھی ہے تیرے باپ

کی بہن اور میری بیٹی۔''

نکو جواب پا کر دیدی کی طرف لپکتا ہے اور بڑے استعجاب اور معصومیت سے پوچھتا ہے۔تم میری پھوپھی ہو کیا؟'' جب دیدی ہاں میں گردن ہلا چکتی ہیں تو اس کے معصوم دماغ میں بڑا بھیانک سوال اٹھتا ہے۔

''پھوپھی تم اتنے دن کہاں رہیں؟ میں نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا؟؟''

دیدی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ـــــ ماں لپک کر نکو کو پکڑ لیتی ہیں۔'' لے بیٹا، یہ تیرے پتا مٹھائیاں لائے ہیں ـــــ''

ماں کے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں۔شاید دھرتی کے کسی ذی حس انسان کی ہمت نہیں کہ وہ بتا سکے کہ دیدی اب تک کہاں رہی ہیں۔نکو مٹھائیوں سے آج بہل جاتا ہے۔مگر کل کلاں پھر وہ وہی سوال کر بیٹھے تو کوئی کیا جواب دے گا؟ غالباً دیدی کو اس حقیقت کا کچھ ایسا احساس ہے کہ وہ تھرا جاتی ہیں۔ان کی آنکھیں لہولہان ہو جاتی ہیں۔تو وہ نکو کو پیار سے گلے لگا کر کہتی ہیں۔ایک راکھشش ،صبر کا دھڑ یہاں سے تو سینکڑوں میل دور ایک سفید مسجدوں والے گاؤں میں پتہ نہیں کب کی خطا تھی۔کب کا قرض تھا جسے اس نے وصول کیا ہے۔

راہو نے امرت کا ایک گھونٹ پیا تھا کہ چندرما نے شمبھو کو اشارہ کر دیا۔ کھلے آسمان پر جب چودھویں کے چاند کو میں دیکھتی ہوں تو پتہ نہیں اس کے اداس چہرے میں مجھے کتنا درد سمٹا سمٹا یا ملتا ہے۔ راہو کے منہ اور گلے سے گزرتے وقت خبر نہیں ،اس خاموش چاند کو اپنا کتنا لہو جلانا پڑا ہوگا کہ اس پورے چاند کی پھیکی روشنی میں ماری دھرتی اداس اور سوگوار دکھائی پڑ رہی ہے۔

کوئی پلٹ کر ماں کی طرف دیکھ لے۔ بھیا اور بھابھی کو دیکھے۔دیدی کی بات سن کر کیسے سپاٹ اور پژمردہ ہو گئے ہیں، ان کے چہرے ـــــ ماں منہ پھیر کر آنسوؤں کو گھونٹ لینا چاہتی ہیں۔اور ہنستے ہوئے نکو کو پیار کرتی ہیں ـــــ ''نکو تیری پھوپھی کی شادی ہوگی۔ کچھ دنوں میں دیکھنا، باجے بجیں گے۔پھر وہ اپنی سسرال چلی جائے گی.....''

ماں بھی حماقت کر جاتی ہیں۔نکو سے باتیں کرتے وقت بھلا دیدی کی طرف دیکھ لینے کی کیا ضرورت تھی کہ ان کا چہرہ دیکھتے ہی ماں کی آواز لرز گئی۔

نکو نہیں جانتا سسرال کسے کہتے ہیں۔کوئی سفید مسجد والے اجنبی گاؤں کو دل سے

سسرال مان لے تو دیدی کا آدھا درد بٹ جائے۔ تہہ در تہہ گہرائیوں سے ابھرنے والے دل کا سایہ جب چہرے پر پڑتا ہے تو اماوس کی یاد آجاتی ہے۔ اور سارا وجود یوں پژمردہ ہو جاتا ہے گویا جوہی کے پودوں نے مسلسل کئی برس سے دھوپ کا زہر پیا ہو۔ امرت کی ایک بوند کے لئے پہلے زہر کا کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔ کوئی وقت کے نئے شنکر کو پکارے۔ کالکٹہ کا پیالہ کب سے چھلک رہا ہے۔ دیدی کہتی ہیں اے بھگوان مجھے ذرا سی ہمت دے دے تو یہ پیالہ میں پی جاؤں۔

دیدی کے بعد ہم تین بہنوں کی سسرال بھی کہیں نہ کہیں ہاتھ پسارے اکیلی پگڈنڈی پر نظریں جمائے منتظر ہوگی۔ مگر وہاں سے چل کر کوئی نہیں آتا کہ نئی سہاگنوں کے مہندی رچائے پاؤں کھڑی دھرتی پر نہیں چمچماتی ہوئی ڈولیوں پر پڑتے ہیں۔ لوگ صدیوں کی اسی ریت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ میکے کی گہری ماتا بھری گود سے ہمارا بھی جی اُکتا گیا ہے۔ سسرال کے قوی بازوؤں کے لمس کا ان دیکھا، انجانا سا پر لذت تصور، دور دور تک کھلی چاندنی میں جوہی کی کلیوں کی طرح مہک رہا ہے۔

دیدی کہتی ہیں باؤجی کی امرت منتھن جب ہی پھل ہوگی جب کوئی شنکر وش کا پیالہ گھونٹ جائے۔ مجھ میں ہمت ہی نہیں۔ وہ روز بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہیں۔ کہ وہ ذرا سی ہمت دے دے۔

لیکن میں جانتی ہوں ایسے کتنے وقت، دیدی سوچ کی بلند پرواز کے سہارے پتہ نہیں کس چھوڑے ہوئے سمندر پر سایہ فگن منڈلاتی رہتی ہیں کہ اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ تب وہ بڑی بے کلی کے عالم میں گویا تڑپ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر جوہی کے افسردہ پودوں کو نگاہوں سے تھپکنے لگتی ہیں۔

سانجھ ہوتے ہی جب کرودھی سورج اتر چکتا ہے تو چاروں اور ہلکی ہلکی ٹھنڈ پھیل جاتی ہے۔ تب جوہی کے پودے بھی ٹھنڈے ہوتے ہیں اور کھلے آسمان کی وسعتوں کو تکنے لگتے ہیں کہ چاند ابھرے اور اپنی شیتل چھاؤں کا خیمہ کھینچ دے تو وہ اس کی چھاؤں میں دم بھر سانس لے لیں۔

مگر زرد چاند کو کھلے آسمانوں پر دیکھ کر میرا دل پتہ نہیں کیوں اداس ہو جاتا ہے۔ دیدی کہتی ہیں اس سے اچھی اماوس کی تاریک رات ہی ہے کہ چاندنی کا تصور سیکڑوں میل، بلکہ لاکھوں میل تک نہیں۔ اور اندھکار میں ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے ایک عادت سی پڑ جاتی ہے۔ اور پھر

بولتے بولتے دیدی یوں چپ ہو جاتی ہیں گویا اب کوئی شبدان کے ہونٹوں سے نکلا تو سارا منھ جل جائے گا۔ تب ہی اس کی آنکھیں مجسم سوال بن کر دلوں میں پگھلنے لگتی ہیں۔

دیدی کی آنکھوں میں لرزتا سوال کیا پوچھتا ہے۔ کبھی کبھی میرا من کہتا ہے میں سمجھ رہی ہوں مگر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ شاید دیدی کی آنکھوں کا سوال تشنۂ اظہار ہی رہ جائے گا۔

تم کچھ کہہ بھی چکو دیدی۔ کلیجے پر اتنا بھاری پتھر رکھے رکھے تم کسی دن مر جاؤ گی۔ دم گھٹ جائے گا تمہارا، دیکھ لینا کسی دن—" جواب میں دیدی کے ہونٹوں پر افسردہ سی جلی ہوئی مسکراہٹ رینگ آتی ہے۔" مرنا اور جینا دونوں کٹھن کام ہیں ننھی، یہ سمے سمے اور جگہ جگہ کی بات ہے۔ کہیں کانٹوں کی باڑھ میں بھی زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے تو کبھی پھولوں کے بستر پر بھی من زندگی کو تیاگنے کے لئے دوڑتا ہے۔ سورج کی جو کرنیں مرتی ہوئی زندگی کو امرت پلاتی ہیں۔ وہی نوکیلی کرنیں کبھی بھالے کی نوک کی طرح زندگی کے جسم کو چھید بھی دیتی ہیں۔"

میں دیدی کی باتوں کی گہرائیوں میں اترنا چاہوں بھی تو نہیں اتر سکتی ہوں—— شبدوں اور فقروں کے گہرے سمندر میں کہاں کہاں موتی بکھرے پڑے ہیں، میں نہیں ڈھونڈھ پائی۔ پر میری آنکھیں اتنا ضرور دیکھ لیتی ہیں کہ وقت کا کٹھور سورج اپنی نوکیلی کرنیں سمیٹے جب اتر گیا تو دھیرے دھیرے دیدی کے اداس چہرے میں بھی چمک آنے لگی ہنسی رونے اور ہنسنے کے درمیانی مقام سے آگے بڑھ گئی۔ ہلکورے کھاتے ہوئے پانی میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے تو..... ایک دن بھیا کہیں سے جوہی کے پودے لے آتے ہیں۔" گنی، دیکھ میں کیا لایا ہوں۔"

باہر رم جھم جاری ہے۔ درختوں پر نئے سبز پتے اگ آئے ہیں۔ سر پر بارش کی رم جھم ایک نامعلوم نغمگی بکھیر رہی ہے۔ ایسے میں دیدی ساون کے سہانے گیتوں کی دنیا کی سیر کر رہی تھیں کہ بھیا کی آواز سے ہم دونوں چونک اٹھتے ہیں۔

'کیا لائے ہو بھیا، دیکھوں؟" میں اٹھی تو دیدی بھی ساتھ ہو لیں۔ بھیا کے ہاتھ میں جوہی کے نڈھال نڈھال پودے دیکھ کر خوشی سے میری باچھیں کھل گئی ہیں۔

"جوہی کے پودے بھیا، جوہی کے پودے۔" میں لپکی—— باغ میں یہی تو ایک نہیں، میں لگاؤں گی اسے....."

دیدی بھی خوشی سے بول اٹھیں۔ ''نہیں بھیا یہ گنی خراب کردے گی۔ مجھے دو، مجھے .....''

مجھ سے پہلے دیدی پہنچ گئی ہیں۔ میں لگاؤں گی بھیا، میں لگاؤں گی، دیدی نے چاہا کہ جھپٹ کر بھیا کے ہاتھوں سے پودے چھین لے۔

''تم نہیں بھلی ——'' بھیا نے پودے والا ہاتھ پشت کی طرف کرتے ہوئے کہا ''گنی لگائے گی، کنواریوں کے ہاتھوں سے پودے جلد لگ جاتے ہیں.....''

دفعتاً ایسا محسوس ہوا گویا مکان کی ساری چھت اڑا اڑا دھم سے گر پڑی ہو ایک سانپ سا پل بھر میں سارے جسم سے الجھتا ہوا گزر گیا۔ دیدی کے جسم کا سارا لہو کھنچ کر اس کے چہرے میں سمٹ آیا ہے۔ پلٹ کر بڑی خالی خالی نظروں سے بھیا کی طرف دیکھتی ہیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولتی ہیں۔ ''بھیا.....؟'' اور آواز حلق میں پھنس گئی۔

پتہ نہیں دیدی کی آواز میں اثر تھا کہ خالی خالی نظروں میں کوئی بھیانک سوال تھا کہ بھیا تڑپ اُٹھتے، ان کے ہاتھ سے دونوں پودے آپ ہی آپ فرش پر گر گئے۔ انہوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو آواز نے ساتھ نہ دیا۔ ان کے ہونٹ کانپے اور وہ کمرے سے یوں بھاگے۔ جیسے انہوں نے انجانے میں دیدی کے جسم کے سارے کپڑے کھینچ لئے ہوں۔

اپنے کمرے میں جا کر، وہ کھڑکی کی سلاخ پکڑ کر سسکیاں لے لے کر رونے لگتے ہیں ——

دیدی چپ، میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی یوں خاموش ہوں جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔ کمرے میں ایسا بھیانک سناٹا دفعتاً چھا گیا کہ مکان کے پہلو والی ریلوے پٹری سے گاڑی گذری تو اس کی بھی آواز سنائی نہ دی۔

ذرا دیر بعد ماں کمرے میں داخل ہوئیں اور چیخ کر بولیں۔ —— ''ارے تم لوگ ایسے چپ کیوں ہو، میں کب سے چلا رہی ہوں کہ مہمان آنے والے ہیں۔ رسوئی میں میرا کوئی ہاتھ بٹائے تو تم دونوں کو یہاں سانپ.....''

پھر ایکا ایکی جب ماں کی نگاہیں دیدی کے چہرے کی طرف گئیں تو انہیں عجیب سا لگا۔ انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ''ارے نگوڑیو، تم لوگ کچھ پھوٹو تو —— ایسی چپی کمرے میں

چھائی ہے کہ لگتا ہے کہ میرا ننھا نکو ٹرک کے نیچے آ گیا ہو.......... ''ماں یہ بولتے بولتے رو پڑتی ہیں۔ ''بھگوان کے لئے بھلی......... گنی.......... ''ماں تو واقعی رونے لگیں۔

دیدی چونکی — انہوں نے ایک بار اپنی خالی خالی لٹی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا — اور ماں کے قریب جاتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔ ''چلو ماں.......... ''

یہ پتہ نہیں، ماں کو کچھ محسوس ہوا، انہوں نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا — ''تم نہیں بیٹی، میں تو گنی کو کہہ رہی ہوں، میں تمہیں کہاں ڈانٹ رہی ہوں.......... کہاں ڈانٹ رہی ہوں.......... ''ماں کی آواز پھر رُندھ گئی — اور ماں خود اس گہرے بے مروت سائے کا جز و بن کر رہ گئیں —

پیاس کی شدت سے تڑپتے ہوئے پنچھی جب بے کل ہو جاتے ہیں تو موجیں مارتے ہوئے بھیانک سمندر کی سطح پر منھ مارتے ہوئے نہیں چوکتے — زندہ رہنے کی ہوس خود زندگی کو خطرات کی طرف لے جاتی ہے۔ دیدی جس گھونٹ بھر پانی کے لئے اسی ابلتے اژدہے کی طرح ہلکورے لیتے ہوئے سمندر کی طرف لپکی تھیں۔ اس نے ان کے لبوں کو ڈس لیا اور اب یہ زہر جیسے جیسے دیدی کی رگ و پے میں اترتا ہے۔ مجھے دیدی کا چہرہ زرد، بیمار، گہنائے ہوئے چاند کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے۔

میں دیدی سے پوچھتی ہوں — ''وہ گیانی دھیانی وشوامتر کہاں ہے — جس کے یگیہ کے زور راجہ ہنس ترشنکر بنا آسمان اور زمین کے درمیان معلق جھول رہا ہے۔

''پتہ نہیں — '' دیدی بھولپن سے افسردہ لہجے میں جواب دیتی ہیں — دیوتاؤں کی بات ہم منشیہ کیا جانیں۔ میرے ہونٹ ہاتھ میں تو ایسا زہر سما گیا ہے کہ جوہی کے پودے بھی مرجھا جائیں۔ جس سچائی کو بھوگ لینے کے بعد بھی میں بھولی ہوئی تھی۔ آکاش کے دیوتا اسے ایک چھن کے لئے بھی فراموش نہ کر سکے۔ دراصل میری آتما بڑی پیاسی ہے گنی۔ سمندر کے سمندر پی جاؤں جب بھی یہ پیاس نہیں بجھنے کی۔''

بھیا اپنی غلطی کی معافی مانگتے ہیں۔ دیدی کے سر پر ہاتھ پھیرتے وقت ان کی آنکھیں بھیگ آتی ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا بھلی۔ تو تو ساوتری ہے۔ گناہگار تو ہم ہیں جو بڑی بڑی ڈگریاں لئے زندگی کے نئے پیامبر بنے پھرتے ہیں۔ کیا تو مجھے معاف کر سکے گی بھلی؟''

میں خود سوچتی ہوں، کیا دیدی بھیا کو معاف کر سکیں گی؟

''کوئی کسی کو معاف نہیں کرتا۔ زندگی کے کھیت میں زہر بونا آسان ہے۔ مگر اسے کاٹنا مشکل ہے۔ خود اپنے ہاتھ نیلے پڑ جاتے ہیں۔ مگر یہاں کا دستور ہی الگ ہے جو بوتا ہے وہ کہاں کاٹتا ہے۔ زہر کی اس کھیتی کو زندگی کے وہ بے گناہ ہاتھ کاٹتے ہیں۔ جن کی کوملتا میں دیوتاؤں کا تقدس رچا ہے۔ جب سچائی گھائل پرندے کی طرح وقت کے خلا میں لڑکھڑاتی کسی بے رحم چٹان پر گر پڑتی ہے تو کوئی شکاری خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ سچائیوں کو زخمی کرنے والے شکاریوں سے کوئی پوچھے ان زخمی جسموں پر تم ٹھنڈے مرہم کے پھاہے رکھ سکتے ہو؟''

نکو کا سوال اسی دن کتنا بھیانک تھا۔ دیدی اب تک کہاں تھیں؟ کوئی مٹھائی سے نہیں بہلتا۔ چھوٹے سے معصوم دماغ سے نکلا ہوا یہ سوال آج دیدی کی ساری زندگی پر محیط ہے۔ اور تو اور کوئی ذرا ہمت کر کے چھان پھٹک کر دیکھے تو خود ہمارے دماغ میں کہیں نہ کہیں یہ بھیانک سوال چھپا ہوا ہے۔ پھر باہر لوگوں کا کیا پوچھنا۔

اب شاید دیدی کے ہاتھوں میں کبھی مہندی نہ مسکرائے گی۔ ویران مانگ یوں ہی انتظار کے سوگ میں جلتی رہے گی۔ ماں، انہیں بھی مٹھائیوں سے بہلا کے دیکھو نا۔ یہ لوگ جو دور دور سے دیدی کے لئے چل کر آتے ہیں اور ایک سوال بن کر دیدی کی راہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں.....

وقت دھیرے دھیرے گزر ہی جاتا ہے اور کتنے ہی دکھوں سے چور انسانوں کو تھپکتا تھپکتا گذرتا ہے۔ سمئے کی چھتر چھاؤں بڑی میٹھی ہے۔ میلوں کی مسافت طے کئے ہوئے مسافر بھی اس کے نیچے اپنی تھکان بھول جاتے ہیں۔ جب بہت سے زرد اور بے جان پتے گر پڑتے ہیں تو سوکھی مری شاخ میں زندگی چپکے سے آلیٹتی ہے اور پھر نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ہریالی جاگتی ہے۔ زندگی جتنا کچھ وقت کے سوداگروں کو دیتی ہے اتنا ہی کہیں سے کماتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ساری دنیا ایک جلی جھلسی ہوئی شاخ کی طرح تند آندھیوں میں ٹوٹ کر آ گرے

دیدی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ یوں براجنے لگی ہے جیسے یہ اس کا بڑا پرانا حق تھا۔ اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ لوگوں کے پیہم سوالوں کی دیوار سے گھر کر دیدی خود کو بہت محفوظ سمجھنے لگی ہیں اور چاندنی اور سائیوں کے فریب سے دور ایک ایسے مقام پر جا پہنچی ہیں۔ جہاں امید و مایوسی کے

سپنوں کا گذر نہیں۔ چلو یوں ہی سہی۔ گھر والے بھی اطمینان میں دیدی کو دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ مگر یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو پل پل کی بات ہے۔ شاید — نکو جب دیدی کی بانہوں میں جھول جھول جاتا ہے اور ان سے کہانیوں کی انجان وادیوں کے سیر کے لئے مصر ہوتا ہے تو دیدی اسے ایک قصہ سناتی ہیں۔ جس میں ایک بے خطا عورت کو شوہر کی بددعا نے بے جان پتھر میں بدل دیا تھا.....

پتھر ہونے سے پہلے ایلیا نے اپنے گناہ پوچھے تھے۔ جس کا جواب اس کے شوہر کے منطقی دماغ نے بھی دینے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ سچائی کے لئے کسی منطق کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح منطق کے لئے بھی سچائی بیکار شے ہے۔ پھر، پھر دیدی؟

دیدی چونک اٹھتی ہیں۔ ''پھر پھر..... کس کا کیا پوچھ رہے نکو؟''

''پھر اس پتھر کی مورتی کا کیا بنا.....؟'' میں آگے بڑھ کر دیدی کی ٹھوڑی اٹھا کر پوچھتی ہوں۔ دیدی کی آنکھوں میں صرف دھول اُڑتی دکھائی دیتی ہے۔ وہی کوئی ننھی ننھی کونپلوں سے بھری شاخ کالی دھول میں لرزنے لگتی ہے۔

''بولو نا دیدی اس پتھر کی بے جان مورتی کا کیا بنا —؟''

دیدی مجھے یوں مصر دیکھ کر جان چھڑانے کے لئے کہہ اٹھتی ہیں۔ ''کہتے ہیں گنی اس کو رام کے قدموں کی ٹھوکر لگی تھی۔ جب اس میں نئے سرے سے جان آئی۔ اور ایلیا نے برسہا برس کی قید سے نجات پائی تھی.....''

میں دیدی سے اور کچھ نہیں پوچھتی — میرے دماغ میں بھی ایک سوال تیزی سے آ گیا ہے۔ کیا دیدی کو بھی کسی رام کے قدموں کا لمس چاہیے۔ کیا دیدی کو بھی کسی کا انتظار ہے!

انتظار..... انتظار..... انتظار..... کہتے ہیں دنیا کی ہر شے کو انتظار ہے۔ جوہی کے پودوں کو دن بھر کی دھوپ کے بعد رات کی کھلی شیتل چاندنی کا انتظار ہے۔ تو لکھیا اپنا سب کچھ گنوا کر اسی سود خور بننے کی منتظر ہے۔ کوئی سمندر خود بھی کسی جنم جنم کے پیاسے پرندے کی پاٹ دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک پتلا سا غیر مرئی، ریشمی تار نہ ہو تو خود میں سنسان پگڈنڈیوں سے نگاہیں اٹھا کر پتھر کی مورت میں نہ بدل جاؤں۔

وقت کے ریگستان میں یہی انتظار ہی تو ہوا کا جھونکا بن کر زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔

شاید دیدی کی بے قرار روح کو بھی کسی رام کا انتظار ہے۔

دیدی روشن دان کی سمت دیکھتی ہیں۔ جس کے چاروں اور مکڑیوں نے جال بن رکھے ہیں۔ اور عین درمیان کوئی مکھی بھنبھنا رہی ہے۔ مجھے بھولی بھولی یاد آتی ہے گئی ——— دیدی اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتی ہیں۔ خوب صورت، گلاب کے رنگ کی سرخی مائل ہتھیلی پر گہری سرمئی لکیریں بڑی بھلی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ جوبھیا کے ساتھ آج صبح ہمارے یہاں مہمان آیا ہے۔ کھوئی کھوئی آنکھوں والا افسردہ مہمان کئی برس بیتے، ایک روز میری ہتھیلی کو دیکھتے دیکھتے پتہ نہیں کیا سوجھا تھا کہ اس نے جیب سے رنگوں کی ٹیوب اور برش نکالے۔ اور وہیں چائے کی ڈش میں رنگوں کو گھول کر میرے ہاتھ کی لکیروں کو سیاہ رنگ دیا۔ اور عین درمیان سرخ سرخ پان کے پتے جیسی کوئی چیز بنا گیا تھا۔ اس دن تو میں کچھ سمجھی تھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔ مگر کچھ عجیب سا ضرور لگ رہا تھا اور میں دن بھر اپنے داہنے ہاتھ کو لوگوں سے چھپائی پھری تھی جیسے کوئی بڑی دولت میں نے اس مٹھی میں دبا رکھی ہو۔

''مگر جب بھی میں مکڑی کے جال میں کسی ذی حس کیڑے کو پھڑ پھڑاتا دیکھتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے گویا وہ کھوئی کھوئی آنکھوں والا آرٹسٹ میری مٹھی میں لرزتا دھڑکتا دل دے گیا تھا.....''

بارہ برس کے بعد یہ کھوئی کھوئی آنکھوں والا مہمان جب دیدی کی طرف دیکھتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پوچھ رہا ہو۔ ''میری امانت کہاں ہے؟''

''میری امانت کہاں ہے؟؟''

''میری امانت کہاں ہے؟؟؟؟''

شاید وہ نگاہوں کے اس مفہوم کو سمجھتی ہیں۔ جب ہی تو تڑپ کر اپنی ہتھیلی کو ایک نظر دیکھتی ہیں اور پھر ندامت سے ان کی گردن جھک جاتی ہے۔ دیدی کا کیا جواب ہو سکتا ہے میں جانتی ہوں۔ کھوئی کھوئی آنکھوں والے آرٹسٹ کی امانت یہاں سے بہت دور دیدی ایک سفید مسجدوں والے گاؤں میں کھو آئی ہیں۔ لہولہان دھرتی میں ایک گوشت کے لوتھڑے کی کیا حقیقت؟ وہیں سرخ دھول میں تڑپتا تڑپتا ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ خالی ہتھیلی میں کہیں شاید کوئی خون کی بوند تھرتھرا رہی ہوگی۔ جسے دیدی اکیلے میں دیکھ لیتی ہیں۔

مگر اس نادان رنگوں سے کھیلنے والے ضدی بچے کو کوئی کیا سمجھائے۔ جو باؤ جی کی

امرت منتھن کے پہلے پھل کا ہی دیوانہ ہے۔ جانے اسے پتہ بھی ہے کہ نہیں کہ اس کالکڈھ کے پیالے کو گھونٹنے والے کا کلیجہ پہاڑ جیسا ہونا چاہیے۔ وہ برابر یہی کہے جاتا ہے کہ جنون کے جس اندھیارے طاق پر میں نے ایک مدھم مدھم سا دیپ روشن کیا تھا اگر وہ زمانے کی تند آندھیوں سے بجھ گیا تو کیا ہوا۔ میں وہیں پھر ایک چراغ جلاؤں گا۔ اس تاریک طاق کو میں اجیال دوں گا۔

جانے دیدی بھی خوش ہیں۔ گہنائے ہوئے چاند نے مہینوں کے بعد راہو کے چنگل سے نجات پائی ہے۔ کھلے نیلے آسمان پر یہ چندر ما پونم کا تہوار منانے کو ہے۔ اس کی روشنی میں سارا گھر منور ہوا ٹھا ہے۔

باؤ جی بہت خوش ہیں۔ وہ اجنبی مہمان کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جیسے وہ شنکر بھگوان ہو۔ جس نے زہر کا پیالہ پی کر دنیا والوں کے لئے امرت کی باڑھ کھول دی تھی۔ باؤ جی نے خود ہی کہا تھا۔ اس زہر کو پی چکنے کے بعد تیرا خوبصورت جسم نیلا پڑ جائے گا۔ ایسا بدنما ہو جائے گا کہ لوگ تمہیں دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے اور تمہارے قریب نہ پھٹکیں گے۔

اس نے باؤ جی کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا تھا۔ میں سچائی کی تلاش میں نگر نگر پھرا ہوں باؤ جی، میں اس گاؤں بھی گیا تھا جہاں کی لہو سے نہائی ہوئی دھرتی پر ایک سچائی تڑپتی تڑپتی مر گئی تھی۔ مگر سچ پوچھئے تو سچائی کبھی نہیں مرتی وہ ایک جگہ قتل ہوتی ہے تو کئی جگہ نمو پاتی ہے اسی تواتر پر ہی زندگی کا انحصار ہے۔

دیدی کی ہتھیلی پر دھڑکتا ہوا سیسہ ہے اس کی آنکھوں میں، اس کے دل کے گوشے میں کہیں جا چھپا تھا۔ مانو انگاروں پر راکھ پڑ گئی ہو۔ آج پربھاؤ کے ایک ہلکے جھونکے سے وہ راکھ اڑ گئی۔ اور اندر سے سرخ سرخ لہو کی کوئی چیز جھلک اٹھی ہے۔ کھوئی کھوئی آنکھوں والا یہ نادان آرٹسٹ کہتا ہے۔ یہی ستیہ ہے، یہی سچائی ہے۔

میں کوئی نئے جگ کا گوتم سدھارتھ نہیں ہوں کہ سچائی کی تلاش میں کسی ویرانے میں آنکھیں میچ کر بیٹھ جاؤں۔ میری آنکھوں کے سامنے تو لکھیا کا روپ ہے جو کسی بیمار پرندے کی طرح مسلسل ہانپے جا رہا ہے۔ اور اس کا پیار، مریل سا بچہ پھر چند دنوں سے رات دن روتا رہتا ہے۔ باہر کا دودھ اسے ہضم نہیں ہوتا۔ اور لکھیا کی چھاتی مرگ بھومی بن گئی ہے۔ کوئی وشال ریگستان جس میں کہیں کوئی چھتر چھاؤں نہیں، کہیں ٹھنڈے پانی کا کوئی چشمہ نہیں۔

ماں جب جوہی کے پودوں کو پانی بغیر سوکھتا دیکھتی ہیں تو چلا اٹھتی ہیں۔ اسی کڑی دھوپ میں کوئی چلّو بھر پانی نہیں دیتا، "لکھیا رانی ہوگئی ہے رانی۔"

ماں کو کاش پتہ ہوتا کہ اس کے باغ کا اکیلا پودا بھی وقت کی کڑی تمازت میں جھلس رہا ہے۔ وہ خود ایک بوند پانی اس پر نہیں ٹپکاتی۔ ماں کی چھاتیاں کالی بھومی کی طرح نرسج بن گئی ہیں ——— یہ بے حیائی بھی تو ایک ستیہ ہے؟

گوتم نے کہا تھا۔ چودہ برس بعد جب رام اس گھنے جنگل سے گذرے گا تو اس کی پاؤں کی ٹھوکر سے تم پر جان آجائے گی۔ چودہ برس سے ایلیا پتھر کی مورتی بنی انتظار کر رہی ہے۔

ماں کہتی ہیں ——— بھلی اب خوش رہتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی اداسی دور ہوگئی ہے۔ یہ الٹی سیدھی تصویریں بنانے والا آرٹسٹ، اسی میں تو رام کا گن ہے، اس کے چھوتے ہی میری بیٹی پتھر سے انسان بن گئی ہے۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ گندے اور تاریک کمروں میں سفیدی پھیری جا رہی ہے۔ دیواروں، کھڑکیوں سے مکڑی کے جالے اتارے جا رہے ہیں۔ وسیع باغ میں سے خاردار جھاڑیوں کو اکھاڑ کر پھینکا جا رہا ہے۔ لوگوں کے اداس چہروں پر سرخیاں پھیل رہی ہیں۔ سارا گھر خوش ہے۔ خود دیدی کی آنکھوں میں کہیں دور سے چراغ روشن ہوا ٹھے ہیں..... زندگی دولہن بننے کے بے تاب ہے۔

ایسے میں نہ جوہی کے پودوں کا خیال آتا ہے، نہ لکھیا مالن کے بیمار بچے کی مسلسل ریں ریں، ماحول کی نغمگی کو توڑتی ہے۔

مگر دیدی کی شادی نہ ہوسکی۔ نرم غالیچوں پر چلتے چلتے کہیں سے ایک موتی اس کے تلوے میں چبھ گیا۔ دیدی اچانک چونک اٹھیں، گویا اب تک جو خوابوں کے گجرا گوندھ رہی تھیں۔ اس کی ایک ایک کلی ٹوٹ کر بکھر گئی ہو۔

شادی کے دو دن قبل کہیں کانا مالی شراب کے نشے میں دھت کسی ٹرک کے نیچے آکر جاں بحق ہوگیا۔ لکھیا کے بیمار بچے کی ریں ریں کے ساتھ خود لکھیا کی بین اتنی دردناک تھی کہ شادیانے کی آواز بھی مجروح ہوگئی۔ باؤجی نے بھی گردن اٹھا کر کہا۔ کوئی اس بدنصیب کو چپ کرائے۔ شادی کے گھر میں اس کی آہ وزاریاں بدشگونی ہے۔ مگر لکھیا کی ہزار منع کرنے کے بعد

بھی اسی طرح چیخیں جاری ہے۔ اس تنہا دنیا میں اپنے مریل سے بچے کے اکیلے بھاگ کو رو رہی ہے۔ اسے شاید اس بات کا غم نہیں کہ اس کی زندگی کا رفیق اس سے بچھڑ گیا۔ اسے غم ہے تو اس بات کا کہ اس کا بچہ آج یتیم ہو گیا۔ اس کے سر سے ٹھنڈا سایہ اٹھ گیا۔ اب وہ وقت کی کڑی تمازت میں کسی ٹھنڈے بادل کی باٹ جو رہا ہے۔

دیدی بھی سچ ہی کہتی ہیں کہ کبھی کانٹوں کی باڑھ میں بھی زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے تو کبھی پھولوں کے بستر پر بھی من زندگی کو تیاگنے کو بے قرار رہتا ہے۔ یہ سمئے سمئے اور جگہ جگہ کی بات ہے۔

دیدی کے سمئے اور جگہ نے ساتھ نہیں دیا۔ زماں و مکاں راس نہ آیا تو شہنائیوں کی آواز ان کے کان میں بچھو کے ڈنک کی طرح چبھنے لگی۔ انہوں نے خود اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں..... نہیں نہیں..... نہیں نہیں..... میں شادی نہیں کروں گی..... میں شادی ..... جیسے انہوں نے سفید مسجدوں والے گاؤں میں کوئی جوہی کا پودا چھوڑ دیا ہو۔ جس کی اچانک یاد نے انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔

کھلے آسمان پر چندرما کو دیکھ کر راہو نے کہا۔ ''میں برسہا برس سے تمہارے تعاقب میں ہوں۔'' اور چاند گہنا گیا۔ دیدی کے گالوں پر جو کہیں سرخی آ رہی تھی وہ معدوم ہو گئی۔ راہو نے چندرما کا خوب خوب لہو پیا—— زندگی جو کہیں سے ذرا سا مال و متاع کما لائی تھی۔ وقت کے سودخوروں کے حوالے کر کے پھر ایک دم سے زرد پڑ گئی۔

OO

صبح کا دامن

رات کی بات اور ہوتی۔ رات تو شراب کے نشے میں دھت ہوتی۔ کبھی سولن کی رم و کی کبھی ادنی درجے کی بھٹیوں سے چلائی گئی۔ شراب پی کر، ریشم کے رنگین اسکارف لپیٹے، چیختی، شور مچاتی، لڑکھڑاتی وقت کے فرش پر اس کے پاؤں ٹکتے ہی نہ تھے۔

مگر دن اس کے برعکس ہوتا، اداس، پژمردہ بے رنگ و بو، زندگی اور اس کے ہنگامے سے محروم کسی بیوہ کے بھبھوت جسم کی طرح ویران.....!

صبح، مشرق گرجا کے پچھواڑے سے اپنے سارے جسم پر بھبھوت مل کر طلوع ہوتی۔ اینگلو انڈین کالونی کے اس تنگ و تاریک گھٹے ہوئے، تنگ تنگ گلیوں، بجبجاتی ہوئی موریوں والے محلے میں صبح طلوع ہوتی تو لگتا، کوئی رنڈی رات بھر جسم نچوانے کے بعد ابھی ابھی بستر سے ڈگمگاتی اٹھتی ہے۔ بستر سے اٹھ کر برآمدے، پھر باتھ روم تک جاتے جاتے وہ گر جائے گی۔ لڑھک جائے گی۔ اوندھے منہ پکے فرش پر، وقت کے بے رحم پکے فرش پر گر کر بکھر جائے گی۔ خالی گلاس کی طرح چھناکے کے ساتھ بکھر جائے گی۔ ایسی تھکی ہماری صبح، ایسی لٹی لٹائی صبح، ایسی ماری پٹی صبح، صبح.....

مائیکل سلاخوں سے پیچھے پکے فرش پر سویا، دیکھتا رہتا،، اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتا۔ مشرقی افق کے پاس سے جہاں سرو کا قد آور درخت تھا۔ اور عین اس کے دس ہاتھ کے پرے پرانے گرجے کے نیم منہدم مینار کے بیچوں بیچ صبح نمودار ہوتی، پھر سپیدۂ سحر بکھرنے لگتا۔ ایک دودھیا رنگ فضا میں بکھر رہا ہے مائیکل دیکھتا، سارا عالم، دن بھر دھول اڑاتی ہوئی کچی سڑک، بڑا سا نالہ، اس کے پرے محلے کا کچرا پھینکنے والا متعفن ٹب، گندی نالیاں، پھر اس کے پرے مسلمانوں کے

چھپر پوش مکانوں کا بے ترتیب سلسلہ، ذرا ادھر پانی کا نل، ڈسٹرکٹ بورڈ کا بیمار مدقوق لیمپ پوسٹ جو جانے رات کے کس پہر پھک پھک کر اور سیاہ دھواں اگل اگل کر بجھ چکا ہوتا۔ یک طرفہ نالیوں کی چھتوں والے سات بے ترتیب اُجڑے اُجڑے مکانات، جن کا نام اینگلو انڈین کالونی پڑ گیا تھا۔ پھر ان سات مکانوں کے آخر میں بائیں طرف شہر کی جانب مڑنے والی کچی سڑک کے کونے پر استادہ لکڑی کا ستون جس پر کبوتروں کا کابک بنا ہوا تھا............سارا عالم ایک ناقابل فہم، ایک نیم آشنا، نیم اجنبی سا دودھیا رنگ میں ملفوف ہوتا۔ تھوڑی دیر تک یہ دھند چھائی رہتی۔ اور صبح ایک دم سے غبارہ کی طرح پھٹ پڑتی۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ سرخ چھپروں کو چومنے لگتی اور تیسرے مکان کے بیرونی کمروں سے بوڑھے دمے کے مریض مسٹر ڈیوڈ کی کھانسی بیدار ہو جاتی اور اس کی سیاہ فام بیوی کی گالیوں اور کوسنوں کا آغاز ہو جاتا اور عین اسی وقت بوڑھی جو زیفائن کے ڈربے کا دروازہ کھلتا، گڈ گڈ کرتی، سر نہوڑے پکتی ہوئی مرغیوں کے درمیان سے اچھل کر اس کا آرش مرغا پر پھڑ پھڑاتا اور کبوتروں کے کابک پر چڑھ کر حسب معمول طلوع صبح کو پہلے جھک کر سلام کرتا، پھر گردن اٹھا کر اعلان صبح کرتا............

اور صبح کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ بیدار ہو جاتی۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سر کو کپے فرش پر لایعنی طور پر پٹکا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ مسلمان لڑکی عاصمہ آئے گی اور اپنے پیتل کے برتن کو چولھے کی چھائی سے زور زور سے مانجھے گی۔ ٹھیک اس کے فوراً بعد جوزیفائن ہوگی۔ خمیدہ کمر بڑھیا جھریوں والا سیاہ چہرہ، پیوندوں والے میلے فراک میں ملبوس وہ حسب دستور آنکھیں ملتی۔ رُک رُک کر پانی کے نل کے پاس آئے گی۔ نل کے قریب رُک کر لمحہ بھر کے لئے اپنے سانس کو درست کرے گی۔ پھر عاصمہ سے کوئی ہلکا سا خوبصورت سا مذاق کرے گی۔ پھر نل سے پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارے گی۔ پھر رات کا بجھا ہوا مڑا تڑا سگریٹ، اپنی سوکھی ماری انگلیوں سے درست کرے گی۔ اور گھسی ہوئی ایڑی والی سینڈل سے کھٹ کھٹ کرتی اس کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوگی اور سانس کو ٹھیک ٹھاک کرکے بولے گی۔

"مائی سویٹی، مائی بوائے! اٹھو صبح ہو رہی ہے اسے لپک کر اپنی مٹھی میں پکڑ لو، پھر سارا دن تمہارا ہے............"

مائیکل کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے گھنے خشک بھورے بالوں میں جوزیفائن کی

کھردری اُنگلیاں آہستہ آہستہ کنگھا کر رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر تسابل سے چار مینار کا پیکٹ نکالا۔ سگریٹ ہونٹوں سے لگا کر سلگایا پھر تیلی کو جنگلے سے باہر کر کے دو سوکھے مرے پڑی جے ہونٹوں کے درمیان پھنسے ہوئے ادھ جلے سگریٹ کو سلگا دیا۔

''تم جھوٹ بولتی ہو آنٹی!'' مائیکل نے تنگ پتلون کو چنگیوں کی مدد سے جانگ پر سے پکڑا اور اوپر کھینچ کر اکڑوں بیٹھ گیا اور سارا کا سارا دھواں اس کے چہرے پر پھینکتے ہوئے مسکرایا۔

''میں تھک گیا، بائی گاڈ صبح تو صبح اس کا ایک لمحہ بھی گرفت میں نہیں آتا.....!!''

''رونگ مائی ناٹی بوائے'' رونگ! تم کو پتا ہے تمہاری ماں نے تمہیں ورکشاپ سے کیوں اُٹھالیا ہے۔ تمہیں پتا ہے تمہاری ممی کیوں تمہیں اپنے جوئے خانے کے دروازے پر بٹھائے رہتی ہے؟''

''ہاں کیونکہ ورک شاپ کے گندے ماحول میں اور سخت کام کی وجہ سے میرا رنگ اور صحت خراب ہو رہی تھی۔''

''اونو..... تم نے پہلا شیو کب کیا تھا بولو؟'

مائیکل قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا۔ ''واٹ اے جوک مائی آنٹی!'' اور اپنے نتھنے پر انگلیاں پھیرتا، جہاں پتلی کٹار کی طرح ترشی ہوئی بھوری مونچھیں، نہیں بلکہ مونچھوں کے بھورے روئیں یہاں سے وہاں تک قطار کی طرح سجے ہوئے تھے۔ ''ابھی ہی تو شیو کیا تھا، مونچھیں بنوائی تھیں!!''

''ابھی تم میری بات نہیں سمجھ سکتے۔ تم جب تھوڑا اور بڑے ہو جاؤ گے تب..... ہاں تب.....''

پھر جوزیفائن آگے بڑھ جاتی۔ ایسے..... ایسے جیسے اس کے ذہن میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجنے لگتیں، توازن سے، تسلسل سے، یکسانیت سے، جس پر پرانے گرجا کی بے ہنگم گھنٹیوں کی صدائیں چھا جاتیں۔

جب ہی اس کی ماں اسے جگانے آتی۔ بڑے پیار سے اس کی پیشانی پر ایک بوسہ ثبت ہوتا۔ اس کے چہرے پر پھول سا ہاتھ کا لمس بکھرتا اور اتنے میں اس کا سارا وجود، وجود کا ذرہ ذرہ جاگ اٹھتا۔ اور وہ لپک کر ممی کو اپنے بھاری بھاری بازوؤں میں دبوچ لیتا۔ ''اوہ..... مائی ممی ڈارلنگ..... ممی ڈارلنگ.....!''

پھر اس کی ماں اس پر خفا ہوتی ــــ ''یو نان سنس، ابھی پرسوں ہی تو تم نے مونچھیں بنوائی تھیں۔ ارے ابھی تو.....''

اور وہ شرما جاتا۔ پھر ناشتے کی میز پر اس کی ماں یہ ذکر لے بیٹھتی جب عین اس کے سامنے اس کی بڑی بہن بیٹھی ہوتی۔ جو ہر رات ڈنر پر نہیں ہوتی۔ جو سر شام حد درجہ، خوبصورت اور قیمتی کپڑے پہن کر، میک اَپ کر کے کسی نہ کسی جیپ کسی نہ کسی کار میں بیٹھ کر چلی جاتی اور رات کو جانے کب لوٹتی ہے۔

للّی ایک دفعہ اس کی طرف دیکھتی، گہری، تیز، تمسخر آمیز نگاہوں۔ پھر اس کا چہرہ مسکرا اٹھتا ہے۔ پھر اس کی ماں اور بہن مل کر زوردار قہقہہ لگا دیتیں۔

اور پھر اس کی بہن للّی جو شاخ گل کی طرح نازک تھی۔ اس کے ساتھ ننگے فرش پر اونچی ایڑی والی سینڈل کو کھٹکھٹاتی والز کی مشق کرتی ہوئی آہستہ سے ہونٹوں کو بھینچ کر کہتی ــــ ''فینی کل شام مجھے پھر ملی تھی ــــ''

پھر لاپروائی سے مائیکل نظر اٹھا کر للّی کی طرف دیکھتا اور قصیدہ پیروں پر اس کی نگاہیں یوں جم جاتیں کہ اس کی سماعت کے ساتوں پردے کھل اٹھتے۔ للّی کے ہونٹوں پر فینی کا نام اور مسکراہٹ یوں خلط ملط سی رہتی کہ دونوں میں فرق ہی نہ رہتا تب کئی سیکنڈ کئی اجنبی دھڑکتے ہوئے لمحے گزر جاتے تو مائیکل بول اٹھتا۔

''کہاں؟''

جواب میں للّی مسکراتی پھر کہتی مائیکل ڈارلنگ ہے تو بے حد سویٹ مگر..... مگر.....!''

مائیکل کے پاؤں رک جاتے۔ اور ایک لمحے کے لئے وہ اپنی عمر سے دوگنا سا ہو کر للّی کو عجیب نظروں سے گھورتا۔ ''مگر کیا سسٹر؟''

''مگر وہ کہتی ہے ــــ'' للّی اپنی اونچی ایڑی والی سینڈل کو اسٹول پر رکھ کر تسمہ کھولتے ہوئے کہتی کہ لندن کے میکس محلے کی بارہویں گلی میں اس کی آنٹی رہتی ہے جس کا لڑکا پال بینک میں کلرک ہے.....''

للّی پھر چپ ہو جاتی۔ وہ کنکھیوں سے مائل کی طرف دیکھتی جس کی بے چینیاں بڑھتے بڑھتے انتہا کو پہنچ جاتیں۔ لپک کر مائیکل اس کے بازوؤں کو دبوچ لیتا ــــ ''پھر؟''

"پھر مجھے کیا معلوم——" وہ اپنے بازوؤں کو مائیکل کی مضبوط گرفت سے آزاد کرتے ہوئے ہنستی اور تب دفعتاً مائیکل محسوس کرتا کہ عمر میں وہ اپنی بہن سے بہت چھوٹا ہے اور جس موضوع پر للّی سے بات کر رہا ہے وہ کچھ ایسا نہیں کہ یوں بے حیائی سے وہ اپنی بڑی بہن سے کھل کر بات کرنی شروع کر دے۔

"فینی ہے کہاں؟"

"یہ والز بھی عجیب رقص ہے کیوں مائیک؟ جیسے سمندر کی کوئی لہر جھومتی ہوئی، ہولے ہولے اٹھلاتی ہوئی کنارے تک جائے اور ساحل کو چوم کر ہولے ہولے بدمست شرابی کی طرح بیچ سمندر میں آجائے—— کیوں؟"

"سسٹر پلیز، ٹالو نہیں، فینی کہاں ہے؟"

"وہ کل ہی آئی ہے...... تمہیں نہیں ملی؟"

"مجھے کیوں کر ملتی۔" وہ بن کر بولتا—— "مجھ سے کیا غرض اسے!"

"سو میں نہیں جانتی——" للّی بھی بن کر جواب دیتی اور اندر کمرے میں چلی جاتی——

پھر مائیکل سوچتا کہ فینی جو اس سے تین سال بڑی ہے۔ مگر جو اسے بہت پسند کرتی ہے۔ یقیناً کلکتے سے آگئی ہوگی۔ اگرچہ پرسوں ہی اس کا طویل خط ملا ہے۔ جس میں اس نے اپنے آنے کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا ہے۔

پھر وہ سارا دن ممی کے جوئے خانے کے باہر بیٹھا بیٹھا فینی اور اس کے خیالوں کے گرداگرد گھرا رہتا۔ پھر سورج غروب ہوتے ہی مائیکل ڈیوڈ کے یہاں پہنچتا" جو اس کالونی سے تین میل کی دوری پر رہتا ہے۔ تو اسے واقعی فینی ملتی۔ گہرے سرخ پھول دار فراک میں بے حد گہرا میک اَپ کئے۔ اڑتے ہوئے بالوں کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اپنے بڑے سے السیشین کو روٹی کا ٹکڑا کھلا رہی ہوتی۔ اور پھر جب فینی کی نظر لوہے کے سلاخوں والے گیٹ کے باہر چٹان کی طرح خاموش کھڑے ہوئے مائیکل پر پڑتی، تو وہ لپک کر اس سے یوں لپٹ جاتی جیسے اسے برسوں سے مائیکل کا انتظار ہو۔ "مائی ڈارلنگ......!"

پھر مائیکل ذرا رنجیدگی سے اس کے ہاتھ کو اپنی گردن سے الگ کرتا اور خاموشی سے برآمدے پر پڑی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور بہت دیر بعد فینی کے بار بار پوچھنے پر لندن والے

پال کا ذکر کرتا۔ تب وہ بڑا زوردار قہقہہ لگاتی۔

''یو جیلیس میں نے کب تمہاری سسٹر سے پال کا ذکر کیا؟'

''تو کیا وہ جھوٹ بول رہی تھیں؟''

''نہیں تمہیں بنا رہی تھیں۔''

پھر وہ مائیکل کو گرم گرم کافی کے ساتھ کلکتے کے ایرٹائٹ ڈبے میں بندرس گلے کھلاتی اور اس کو لے کر لمبی سیر کو نکل جاتی۔ اور بات بات پر فینی قہقہے لگاتی۔ پھر بے خیالی میں ''جزک پال'' کا ذکر لے بیٹھتی اور اسی شہر میں اس کے ایک دم پاس ہوتے ہوئے بھی پتا نہیں کس اجنبی آسمان پر پرواز کرتی رہتی۔ اور تب ایکا ایکی اسے احساس ہوتا کہ اس کا وجود بھی عجیب بیکاری شے ہے۔ جس کا شاید کوئی مقصد نہیں۔

تب وہ جھلا کر زور سے ایک ٹھوکر مارتا اور سامنے پڑا ہوا پتھر غلیل سے چھٹے ہوئے ڈھیلے کی طرح زناٹے سے اُڑ جاتا۔ اور فینی پلٹ کر اسے گہری، ایک ذرا خوف زدہ نظروں سے گھور کر دیکھتی اور اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیتی۔ تم کب.........؟''

''کیا؟'' وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا اور فینی کے چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ اجاگر ہوتی اور وہ اس کے قریب ہو جاتی۔ مگر پھر اپنا نامکمل جملہ دہرانے کی اس میں جرأت نہ ہوتی۔

''کبھی نہیں، میں کبھی بڑا آدمی نہیں ہونا چاہتا۔'' پھر وہ خاموش ہو جاتا اور سامنے رات کی روشنیوں میں درختوں کے سیاہی مائل گہرے سبز پتوں کو گھورتا ہوا چلتا رہتا۔ جسے آغاز مارچ کے دن کی بولائی ہوئی ہوا اب سرد ہو کر آہستہ آہستہ چوم رہی ہوتی۔ پھر وہ دفعتاً رک جاتا اور لیمپ پوسٹ کی تیز دودھیا مرکری روشنی میں بش شرٹ کی آستین الٹ دیتا۔ اور دونوں بازوؤں کو دیکھتا جہاں مچھلیاں الٹ الٹ گئی ہوتیں۔

''فینی ڈارلنگ! تم نے میرے بازو دیکھے ہیں؟''

''اوہ ——— یس!'' وہ بہ ظاہر لاپروائی سے بولتی اور آگے بڑھنے کو ہوتی کہ مائیکل روک لیتا۔

''اور میرا سینہ؟''

''.........ہاں!''

''اور میرا پانچ فٹ سات انچ کا لمبا قد؟''

''ہاں..... سب کچھ ——— سب کچھ.....''

''اس لندن کے میکس محلے میں رہنے والے پاس کے یہ سب کچھ ہے؟''

''اوہ یس..... نیور نیور کبھی نہیں۔ اور قہقہہ لگا کر آگے بڑھ جاتی۔

اور وہ اپنے ہونٹوں کو خواہ مخواہ چباتا رہتا۔ اور فینی کو کبھی کھا جانے والی اور کبھی چوم لینے والی نظر سے دیکھتا رہتا..... دیکھتا رہتا۔

پھر ساری رات وہ بستر پر پڑا پڑا سوچتا رہتا۔ اور فینی ایک جھولے میں بیٹھی ہوئی پینگ کے ساتھ اس کی آنکھوں، اس کے وجود سے دور ایک دم افق میں ٹنگی نظر آتی۔ پھر دن بھر وہ ممی کے بڑے سہال کے دروازے پر پہرے دار کی حیثیت سے بیٹھا بیٹھا سوچتا رہتا۔ اور فینی ہنستی ہوئی کبھی اس کے پاس آتی، کبھی والز کی موجوں کی طرح ساحل کو چھوڑ کر جھومتی ہوئی بدمست سی آنکھوں سے دور سمندر کے بیچوں بیچ ایک خواب کی طرح مبہم مبہم سی دکھائی دینے لگتی۔

پھر عین اسی وقت اس کے سر پر ایک زوردار چپت پڑتی۔ ''وائی آر یو سلیپنگ ڈنکی.....؟''

اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور اپنی ساری کی ساری بتیسیاں نکال دیتا۔ تب مائیکل دیکھتا کہ اس کی بتیسیاں اس کے شعور سے الگ شے بن گئی تھیں اور اس کے ہاتھ جو چپت مارنے والے لڑکے کے سامنے پھیل جاتے، ان کا بھی اس کے وجود سے تعلق نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی بے تعلقی اس پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس کی شخصیت جو فینی کے قریب رہتے وقت قدرے طاقت ور، بھرپور اور اہم ہوتی۔ بکھر جاتی، چھتر اجاتی ہے۔ جیسے دانوں کے ڈھیر میں کوئی پتھر گر جانے سے سارے دانے بکھر جاتے ہیں۔

وہ مڑا تڑا نوٹ لے کر اپنی چست پتلون کی ہیپ پاکٹ میں ٹھونستا ہوا لمبی سڑک پر بے تعلقی اور غیر ارادی طور پر چل پڑتا۔ پھر یہ سڑک پیچ دار گلیوں میں سے ہوتی۔ گندے محلوں کی خاک چھنواتی۔ اسے بیر سنگھ کی جھونپڑی کے دروازے پر لا کھڑا کرتی۔ جہاں سے اسے بوتلیں ملتیں کبھی دو، کبھی تین، دیسی شراب سے بھری ہوئی بوتلیں جنھیں وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے لمبے کوٹ میں چھپا لیتا اور پھر انہیں راستوں پر جھومتا، سیٹیاں بجاتا واپس چل پڑتا۔

''مسز جوزیفائن، کین یوٹیل می، وائی آئی ایم سو اسمارٹ؟''

''کیا؟'' مسز جوزیفائن تھم جاتی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا کر رہ جاتے۔ وہ اکتاہٹ اور تھکان سے اپنے دائیں کندھے پر رکھے ہوئے تھیلوں کو آہستگی سے بائیں کندھے پر پھینکتی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک مبہم صبح جگمگاتی۔

''کیونکہ تم جوان ہو!''

''نہیں تم بھی نہیں بتا سکتیں۔'' پھر مائیکل اپنے کوٹ کو پھیلا کر اپنی دونوں بغلوں کو دکھاتا۔ جہاں دو بوتلیں آرام کر رہی ہوتیں۔

مسز جوزیفائن کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا۔ ''تمہارے لئے؟''

''نہیں، ہمارے یہاں جو لوگ فلش کھیلنے آتے ہیں۔''

''وہاٹ اے گریٹ یو، اینڈ وہاٹ اے گریٹ یور می..................!''

مسز جوزیفائن آگے بڑھتی اور اس کے گال پر تھپکی لگاتی اور کھٹ کھٹ کرتی دوسری طرف چل پڑتی۔ تب اسے محسوس ہوتا کہ ایک چابک شڑاپ سے لہرا کر اس کے پہلو سے نکل گئی۔

اور وہ چھوٹے سے ہالٹ اسٹیشن کے پل پر کھٹ کھٹ چلتے ہوئے رک جاتا اور اونچائی سے دیکھتا، دور، سینکڑوں فٹ دور وہ لوکو شیڈ جہاں وہ ورک شاپ میں ٹرنر کی ٹریننگ حاصل کرنے جایا کرتا تھا ورک شاپ کی میلی زنگ آلود کیسٹر شٹ جو دھوپ میں چمک رہی ہوتی اور ایک طرف سے گاڑھا دھواں اٹھتا آسماں کی سمت بڑھ رہا ہوتا۔ اور جہاں مکرجی اپنی ایک سچی، ایک لکڑی کی ٹانگ کے سہارے کھڑا دن دن بھر محنت کرتا رہتا اور وہ اس کی پیٹھ پر دھول جمایا کرتا جس کے جواب میں مکرجی اپنی بتیسیاں نکالے جھومتا رہتا۔ اور اپنی لکڑی کی ٹانگ سے اسے مارنے کی کوشش کرتا رہتا۔

''الو کا پاٹھا——— تم آجا والا ٹانگ چلاؤ۔ ....اچا والا ....''

''اچھا والا تمہارا اسٹر کودے گا بیٹا، سمجھا اور وہ یہ کر بے تحاشہ قہقہہ لگاتا اور لپک کر بیلٹ پر ہاتھ مار کر گئیر بدل دیتا۔ اور اپنی میلی آستین سے چہرے کا پسینہ پوچھتا مشین پر جھک جاتا۔

تب دفعتاً مائیکل کی کنپٹیوں سے ہوتی ہوئی ایک ٹھنڈی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈیوں کو چومتی نیچے اتر جاتی۔

اور وہ آگے بڑھ جاتا۔ گلی میں گزرتے ہوئے وہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ ایک بہت تنگ موری سے گزر رہا ہے اور جیسے ہی گلی کو طے کر کے باہر سڑک پر آتا۔ گرم ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر بیٹھتا اور تب وہ دیکھتا کہ پانی کے سنسان نل پر وہ مسلمان لڑکی پانی سے بھرے گھڑے سامنے رکھے کسی راہ گیر کا انتظار کر رہی ہے۔ جس کی مدد سے وہ گھڑے اپنے سر پر اُٹھواتی۔

پھر ایک ثانیہ کو مائیکل کے پاؤں رک جاتے اور ایک لمحہ کے لئے عاصمہ کی بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف اٹھتیں اور اُس کے مفلوج سے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے واپس پلٹ جاتیں اور جواب میں وہ نادم نادم سا آگے بڑھ جاتا اور بڑھتے بڑھتے پلٹ کر ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالتا تو وہ مسکرا رہی ہوتی۔ جیسے سب کچھ جانتی ہو.......... سب کچھ..........!

مگر وہ کچھ نہیں جانتا.......... کچھ نہیں..........!

ہر روز، ہر صبح سے شام تک جب تک اس کے پچھواڑے کے بڑے سے ہال میں کالونی کے لڑکے اندر فلش کھیل رہے ہوتے، اور اس کی ممی سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتی قہقہہ لگا رہی ہوتی۔ وہ یہی کرتا، کبھی سگریٹ ماچس، کبھی شراب کی بوتلیں، اس کی ممی نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا۔ بہت احتیاط سے، بڑی ہوشیاری سے میرے بیٹے۔ اگر پولیس کی نظر پڑ گئی تو..........

..........ہاں..........!

ہر روز وہ دروازے کی دراڑ سے آنے والی دھوئیں کی لکیر کو دیکھتا رہتا جیسے کوئی تیز دھار والی تلوار ہو جو آگے بڑھتی آ رہی ہو.......... کمرے سے قہقہے کی آوازیں آتیں۔ شراب اور آدھ پکے گوشت کی بو آتی رہتی۔ اور وہ باہر اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق کچھ نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ کچھ نہیں سن رہا ہوتا۔ اگر دیکھ رہا ہوتا تو یہ کہ سامنے والی سڑک پر کوئی پولیس کا آدمی تو نہیں، کوئی اجنبی چہرہ تو نہیں۔ کیونکہ یہی اس کی ہدایت تھی۔ اس کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ کچھ بھی ہو جائے وہ اندر نہیں جا سکتا۔ اندر کی سمت دیکھ نہیں سکتا۔ اندر کے بارے میں سوچ نہیں سکتا۔

گرمی کی اداس دوپہر اس کے وجود کو تپاتی ہوئی گزر جاتی اور سخت لو کے گرم تھپیڑے اس کے جسم کو پگھلا جاتے۔ مگر وہ کچھ نہیں بولتا، کچھ نہیں سوچتا، اور پرلے مشرقی کمرے میں اس کی بہن للی سو رہی ہوتی۔ جہاں شہتوت

چھیڑتی رہتی۔ اور وہ اپنی خالی خولی نگاہوں سے دیکھتا رہتا۔

اور تب اسے احساس ہوتا کہ اس کا وجود بھی عجیب ہوتا جا رہا ہے۔ جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ کبھی کبھی ٹھنڈی لہر اس کے سینے پر جاگتی پھر سو جاتی۔ تب وہ اپنے آپ کو دیکھتا۔ اس کی موٹی موٹی ٹانگیں، چوڑی چھاتی، وہ اپنی چھاتی پر ہاتھ پھیرتا، اپنی لمبی لمبی گوشت سے بھری گردن کو ٹٹولتا، اس کا ہاتھ چہرے پر پھرتا پھراتا پھر چوڑی چکلی چھاتی پر آ کر رک جاتا، دیکھو میری چھاتی، دیکھو میرے بازو..... میں تم لوگوں سے عمر میں کتنا چھوٹا ہوں مگر چاہوں تو ایک ایک کو.....!

کالونی کے دوسرے لڑکے اسے گھیر لیتے۔ ''سچ مچ..... سچ مچ.....''

''ایسا ہی ہوتا ہے..... ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے روپیوں سے.....!''

''کیسے روپیوں سے؟''

پھر وہ سارے کے سارے لڑکے کھل کھلا کر ہنس پڑتے پھر کہاں سے للی کا ذکر لے آتے.....

اور مائیکل اٹھ کھڑا ہوتا۔

پھر مائیکل کو ایسا لگتا کہ بند کمرے، جس کی طرف جھانکنے تک کی اس کی ممی نے ممانعت کر رکھی ہے اس کے اندر یقیناً وہ کچھ ہے جسے وہ نہیں جانتا۔ دھوئیں کی ایک لچکیلی چابک شڑاپ سے اس کی پشت کے قریب سے گذر جاتی۔

تاریکی میں کسی کار کا ہارن بجتا رہتا۔ اور اس کا ذہن تیز نوکیلی آواز سے چھدتا رہتا۔ اور مائیکل کچے فرش پر کروٹیں بدلتا۔ ساری سیاہ بدصورت رات کو پی جاتا۔ رات رات بھر نیند اور بے خوابی کے عالم میں ساری کالونی میں ٹہلتا رہتا۔ لندن کے میکس محلے کی بارہویں گلی میں اس کے قدم چوروں کی طرح سہم سہم کر اٹھتے۔ کبھی کوئی خوبصورت سا خوش حال سا جزک پال اس کے سینے پر اپنے چرچراتے ہوئے بھاری جوتوں سے چلتا ہوا نکل جاتا۔ کبھی ایک موٹی سی بھدی بے اندازہ گوشتوں سے بھری بھینس ہوتی جو اس کے سینے پر یوں لوٹتی پوٹتی رہتی جیسے گندے جوہڑ میں لوٹنے لگاتی ہے۔ اور رات گذرتی رہتی۔ ایک ایک کر کے آسمان کے تارے افسردہ سے افسردہ تر ہوتے جاتے اور رات گذرتی رہتی۔ شمالی کونے میں عمارت کے پہلو سے نظر آنے والی میٹرو سنیما کی رنگین جاگتی سوتی بتیاں جلتی بجھتی رہتی اور رات گزرتی ہی چلی جاتی۔ اور وہ گھونٹ

گھونٹ کر کے ساری سیاہ رات کو پیتا چلا جاتا۔

مائیکل بڑے سے جنگلے سے جھانک کر دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ریت سی پڑی ہوتی اور سارا آسمان اداس ستاروں سے بھرا پڑا رہتا ہے جیسے اس کے دانت تلے ریت ہی ریت آ گئی ہو۔ اور پھر وہ سو جاتا۔ دھنکی ہوئی رات کا پچھلا پہر بالآخر اس پر جادو کر ہی بیٹھتا اور وہ سو جاتا۔

(۲)

دفعتاً اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے خشک بالوں میں جو انگلیاں پیار سے کنگھی کر رہی ہیں اور وہ محبت بھرے لب جو اس کی پیشانی کو چوم کر الگ ہوئے ہیں وہ اس کی پیاری بہن للّی کے ہیں، جو دن کے اُجالے میں اس سے بھاگی پھرتی ہے اس سے آنکھ نہیں ملاتی ہے۔

پھر اس نے آہستہ سے اس کے نازک نازک سے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اٹھ بیٹھا۔ پھر اس نے اپنی گہری نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

ابھی رات کا حصہ سہم سہم کر گزر رہا تھا۔ اور دم توڑتی ہوئی سیاہی کے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ اور باہر ہوا کے جھونکے گندی گلیوں کے تعفن سے دامن بھرے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ سارے عالم پر دبیز خاموشی چھا چکی تھی۔ اس کے کمرے اندھے بلب کی بیمار روشنی سے اُلجھ اُلجھ کر پتنگے تھکے جا رہے تھے۔ جب دور ریلوے اسٹیشن سے گزرتی ہوئی گاڑی کی سیٹی کی تیز چیخ خاموشی کے جگر کو چیرتی ہوئی اس کی سماعت کو چوم گئی۔

''لیو می مائیکل۔''

''نہیں سسٹر — نہیں، پہلے یہ بتاؤ.....'' مگر آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

''کیا؟'' للّی کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''یہی کہ رات کے کتنے بجے ہیں، اور پھر رات تم اتنی دیر تک.....؟''

للّی نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور آگے بڑھ گئی۔ — ''شٹ اَپ!''

پھر مائیکل میں پتا نہیں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لپک کر اس کے

آگے ایک بھاری چٹان کی طرح جا کھڑا ہوا۔

''نہیں ـــــ آج تمہیں بتانا ہی ہوگا!''

''مائیکل مجھے جانے دو۔'' اُف گاڈ، اس چھوٹے سے پلّے میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی؟ اس نے سوچا ـــــ اور بالوں کو جھٹک کر آگے بڑھ جانا چاہا۔ مگر سامنے پہاڑ کی طرح مائیکل کھڑا تھا۔ ''مائیکل مجھے جانے دو ـــــ میرے بارے میں کچھ مت پوچھو ـــــ میں تمہاری دایہ نہیں.....''

''نہیں ـــــ'' اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ چہرہ تن گیا۔

پھر للّی نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا پھر چوتھا.....

..... پھر جیسے جیسے وہ مار کھاتا گیا اس کا وجود سخت اور ارادے سخت تر ہوتے گئے اور جیسے جیسے وہ مارتی گئی اس کے جسم کی طاقت کم پڑتی گئی۔ حتیٰ کہ اس کے ترکش کے سارے تیر نکل گئے۔ اور وہ فرش پر بیٹھ کر چیخ چیخ کر رونے لگی پھر اس کی ماں جاگ کر دوڑی اور یوں مائیکل کو چٹان کی طرح کھڑے اور اس کے قدموں پر للّی کو بے بس دیکھا تو اس کے غصّے کا پارہ چڑھ گیا۔ اور اس نے اپنی ہیل والی چپل سے مائیکل کو تڑا تڑ مارنا شروع کر دیا۔ اور للّی کو کھینچ کر اندر لے گئی۔

پھر کافی دیر ہو گئی۔ اور شور سن کر کئی گھروں کے لوگ دوڑ کر اس کے کمرے میں گھس آئے اور اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی زبان میں نمکین نمکین ذائقہ ہے اور اس کی ناک کے بانسے میں درد ہو رہا ہے۔ اور اس کی پیشانی اور رخسار اور گردن میں درد ہی درد بھر گیا ہے۔

پھر لنگڑا ڈیوڈ جو اسے برابر بڑی تمسخر سے دیکھا کرتا اور اس کے آتے جاتے فرش پر تھوک دیتا تھا، آگے بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ مائیکل جھٹکا دے کر باہر نکل گیا۔

مائیکل آہستہ آہستہ مضبوطی سے قدم اٹھاتا نل کے پاس گیا کچھ دیر کھڑا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر پلٹ کر بازو والے موٹر گیرج کی طرف ہو لیا۔ جہاں اس کے دادا کے وقت کی فیٹ کار پڑی تھی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور تل چٹوں سے بھری ہوئی گدی پر دھڑام سے گر گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنے منہ میں نمکین ذائقہ پھر محسوس کیا۔ آنکھیں بند کئے کئے کروٹ

ہو کر ایک طرف زور سے تھوکا، اور اپنی سوجی ہوئی ناک کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

پھر آنکھیں بند کیے کیے اسے بہت دیر ہو گئی۔ ٹوٹتی ہوئی رات اس کے پہلو سے گزرتی گئی۔ اور وہ بے سدھ آنکھیں بند کیے کار کی بوسیدہ گدی پر پڑا رہا۔ اور تل چٹے اس کی قمیض کے اندر گھس کر سرسراتے رہے اس کی گردن میں، اس کے بازو میں، اس کے چہرے پر، یہاں وہاں سرسراتے رہے۔ اور اس کا دل خاموشی سے ایک طوفان لئے اندر ہی اندر سنسناتا رہا، پھر رات گزر گئی اور فضا میں صبح کی سفیدی جھلک پڑی اور اس کی ناک کا بانسہ ٹھیک ہو گیا اور اس کا درد کم ہو گیا۔ اور اس کے جسم کا درد کم ہو گیا مگر اس کے احساس کی شدت جوں کی توں رہی۔

پھر کافی دیر ہو گئی۔ دن کا اجالا پھیل گیا۔ اور اس نے سوچا کہ وہ مسلمان لڑکی نل سے پانی بھر کر جا چکی ہو گی۔ اور مسز جوزیفائن بازار کے چوک پر اپنے جھولے بیچ رہی ہو گی۔ اور رات بھر کے سارے معطل کام از سر نو شروع ہو گئے ہوں گے۔ دن جو کبھی نہیں رکتا، کبھی نہیں تھکتا، اپنے صندوق کھول کر ایک چالاک دکان دار کی طرح وقت کے فرش پر اپنے سارے "کھیل" پھیلا چکا ہو گا۔ تو اس نے محسوس کیا کہ یہ دن اسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھینچ رہا ہے۔ "اٹھ جا مائی ڈارلنگ، اٹھ جا.....!"

پھر مائیکل اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے چار مینار کا ایک آدھا ٹکڑا نکال کر جلایا اور لمبے لمبے کش لیتا موٹر سے باہر نکل آیا اور سارا دن سڑکوں پر گلیوں میں بے مقصد پھرتا رہا اور ریلوے پل کی بلندی سے بھاگتی ہوئی گڈس ٹرین کو دیکھتا رہا۔ اور گہرا دودھیا دھواں اُگلتے ہوئے انجنوں کو دیکھتا رہا اور دور ٹیڑھی میڑھی لائنوں کے جال کے بائیں طرف ورک شاپ کی دھواں اگلتی ہوئی چمنیوں کو تکتا رہا۔ اور اس کے احساسات جلتے رہے اور اس میں دھواں اٹھتا رہا۔ خلاف توقع بہت دنوں پر پہلی بار احساس ہوا دن اور دن کا اجالا اور اس کا ہنگامہ اور اس کی حیات بخش گہما گہمی اور اس کی مہربان انگلیاں اس کے زخموں پر ٹھنڈے پھاہے رکھنے کی بجائے اور فزوں کرتی رہیں۔ اور یوں جب بہت دیر ہو گئی اس نے بھوک محسوس کی۔ اس نے پیاس محسوس کی اور یہ بڑھتی رہی اور بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ کمزور ہو گیا اور اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اٹھنی نکالی، اور اسے کلے کی اُنگلی اور انگوٹھے کے ناخن سے اُچھالتے ریلوے پل سے نیچے اتر آیا۔ اور کافی دیر لاشعوری طور پر چلتے چلتے کینٹن میں داخل ہو گیا جہاں اس کے پرانے دوست مکرجی نے

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چونکا دیا—— ''اوہ............ مائیکل کیا ہوا، ایسے بدحواس کیوں ہو..........؟''

''کچھ نہیں——'' وہ آپے میں آ گیا۔اس نے جلدی جلدی اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتا ہوا مکر جی سے لپٹ گیا۔''مائی مکر جی کہاں تھے اتنے دن............؟''اس نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اس کے نیلے سرج کے سوٹ کا کالر پکڑ لیا۔تم............ بہت خوش حال ہو، بہت اچھا سوٹ پہن رکھا ہے اور تمہاری وہ لکڑی کی..............؟''

مکر جی نے اسے دبوچ لیا اور بہت پیار کیا۔اور بہت ساری باتیں بتائیں اور بہت کچھ کہا، بہت کچھ سنایا۔پھر اس نے توش مکھن منگایا آملیٹ اور کافی منگائی مگر مائیکل کچھ نہ کھا سکا۔اس کی دونوں کانپتی ہوئی انگلیوں کے درمیان توش کا ٹکڑا تھر تھرا کر رہ گیا اور وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔اس کی پیشانی پسینے سے بھر گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیوں کے بیچوں بیچ ایک ٹھنڈک سی اوپر سے نیچے کی طرف اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ایک تیز تڑپتی ہوئی چابک شڑاپ سے اس کی پیٹھ پر لگی اور وہ بے تحاشہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دوست مکر جی کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے کینٹن سے نکل گیا۔

اب دوپہر ہو رہی تھی۔ جاڑے کی پیاری دھوپ سخت ہو چکی تھی اور ٹیلیفون کے تار پر بیٹھی ہوئی ایک چڑیا دور تک پھدک کر یہاں سے وہاں تک جا آ رہی تھی اور اس کے پہلو سے گزرنے والی سائیکلوں کی ٹن ٹن، اور زناٹے بھرتی ہوئی کار کی دھول اور آدمیوں، بھوکے ننگے ہانپتے ہوئے آدمیوں اور خوش خوش سائیکل رکشا کھینچتے ہوئے اور ٹھیلا ڈھکیلتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے آدمیوں کی ملی جلی آوازیں، اس کی سماعت کو مضطرب کرتی رہیں۔ اور اس کے پاؤں سارے بازار کا چکر لگاتے لگاتے تھک گئے۔ تو دفعتاً وہ چونک گیا۔ وہ کہاں کھڑا تھا............ یہ وہی جگہ تھی، جہاں وہ دن بھر ایک چالاک پہرے دار کی طرح نظریں سڑک پر آنے جانے والوں پر لگائے بیٹھا رہتا ہے۔اور اندر اس کی ممی بہت سے انگلو انڈین لڑکوں کے ساتھ فلش کھیلتی رہتی اور دروازے کی دراڑ سے دھوئیں کی لکیر ایک اٹھتی ہوئی خنجر کی طرح اس کے سر پر جھول رہی ہوتی ہے............

کچھ دیر وہاں خاموشی سے کھڑا رہا۔اور گہری کچھ پوچھتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا۔

پھر پلٹ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے پیاس لگی ہے، اور بھوک بھی لگی ہے۔ اور بھوک اور پیاس کی شدت اس کے حواس خمسہ پر چھا گئی ہے۔ وہ بھاری بھاری قدم رکھتا ہوا نل کے پاس گیا جہاں عاصمہ پانی سے بھرا گھڑا فرش پر رکھے کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے چور نظروں سے مائیکل کے پریشان چہرے کو دیکھا پھر ہنس پڑی۔

''یہ گھڑا اٹھا دو!''

''کیا؟'' مائیکل نے غصے سے پلٹ کر کہا۔ ''تم کو ڈر نہیں لگتا مجھ سے؟''

''ڈر کاہے کو لگے گا۔'' عاصمہ نے گردن جھکائے جھکائے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب تو تمہارا راج چلا گیا۔ فرنگی لوگ تو کبھی کا چلا گیا۔ اب کون ڈرے گا تم سے!''

دفعتاً مائیکل مسکرا پڑا۔ اس کا غصے اور بھوک سے تپا ہوا جسم ہلکا سا محسوس ہوا اس نے آگے بڑھ کر عاصمہ کو دیکھا۔ سانولی رنگت والی نوخیز سی معصوم لڑکی مائیکل کو بازار میں ٹیلی فون کے تار پر پھدکتی ہوئی چڑیا یاد آئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا گھڑا اٹھا کر آہستہ سے اس کے سر پر رکھ دیا اور اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے سینے پر گھونسہ سا لگا اور للّی یاد آئی، گلہری کی طرح پھدکتی رہنے والی للّی جو بی بی ہارڈ ویئر اسٹور میں کام کرتی تھی اور دن بھر سخت محنت کے بعد بھی شام کے وقت پھول کی طرح کھلی رہتی تھی۔ مگر جس نے پتا نہیں کیوں اچانک ملازمت چھوڑ دی۔ اور دن کے اجالے سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ اور جو ایک بے ایمان چوکیدار کی طرح چاروں طرف تکا کرتی تھی۔ اور آپ ہی آپ کھو جاتی تھی۔ اور جس نے صرف ذرا سا باز پرس کرنے کے عوض اسے تھپڑوں سے پیٹا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ جا کر چپکے سے للّی کو اپنی چوٹیں دکھائے۔ اپنی دکھتی ہوئی ناک کو دکھائے اور اپنی ماں کی آغوش میں چھپ کر خوب روئے، خوب روئے، اپنی بھوک کا تذکرہ کرے اور اپنی پیاس کے بارے میں بتائے کہ وہ کیسے سارے دن کا بھوکا ہے اور اس کے منہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہیں گئی ہے۔ اور اپنے دکھے ہوئے دل کا حال بتائے کہ اس نے کیوں اس بری طرح مارا.....

مگر اس کے پاؤں پھرتے پھراتے اپنے دروازے سے آگے بڑھ گئے۔ مئی کی گرم جھلس دینے والی گرمی برس رہی تھی۔ اور سارا آسمان اور ساری زمین توے کی طرح تپ رہی تھی۔

اور دھول گرم دہکتی ہوئی دھول زمین کی چھاتی سے آہ کی طرح اٹھ کر منڈلاتی پھر رہی تھی۔ اور اس کے پاؤں مسز جوزیفائن کی کھڑکی کے پاس ہی آپ رک گئے اس کے دل میں آیا کہ وہ مسز جوزیفائن سے دو روٹی مانگ کر کھالے۔ بھوک اسے جوئے میں بندھے ہوئے بیل کی طرح دہلائے جا رہی ہے۔ مگر وہ رک گیا۔ اس نے سلاخوں والی کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھا، جہاں مسز جوزیفائن پلنگ پر بیٹھی پرانے ٹاٹ کے تھیلے بنانے میں مصروف تھی۔ اس کی انگلیاں تیزی سے چل رہی تھیں۔ اور ٹاٹ کے ٹکڑے تراش رہی تھیں۔ اور سرخ و سبز رنگ کے دھاگے سے تھیلیوں پر چھوٹے چھوٹے پھول بنا رہی تھیں۔ اور مئی کی گرم دھوپ آسمان سے برسے جا رہی تھی۔ اور ساری دنیا میلوں دوڑی ہوئی گھوڑی کی طرح پسینے سے تر ہانپے جا رہی تھی۔ اور اندر مسز جوزیفائن پسینے میں شرابور تیزی سے تھیلے بنانے میں جتی ہوئی تھی۔

اور اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ مسز جوزیفائن کے سامنے بھی جا سکے۔ اس سے آنکھیں ملا سکے۔ اس سے دو خشک روٹی بھی مانگ سکے۔!

پھر وہ خاموشی سے آہستہ روی سے چلتا ہوا گرم دوپہر میں اپنے دادا کے وقت کے پرانے گیرج میں گھس گیا۔ اور کار کا دروازہ کھول کر چپ چاپ تل چٹوں سے بھری ہوئی سڑی بسی گدی پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے دماغ میں آڑی ترچھی لائینوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ قریب سے گزرتی ہوئی متوازی لائنیں جو آگے بہت دور جا کر ایک سی دکھائی دیتیں پھر کہیں سے ایک چنگھاڑتا ہوا انجن آتا سیٹیاں بجاتا چیختا گزر جاتا۔ اور لوکو یارڈ کے قریب رک جاتا ہے۔ پھر اس سے آگے ریلوے کا وہ ورک شاپ جس کی چمنیاں دھواں اگلتی رہتیں اور اندر شور ہوتا رہتا۔ مشینیں چلتی رہتیں اور لنگڑا انکر جی اپنی لکڑی کی ٹانگ پر سارا بوجھ دیئے مشینوں پر جھکا رہتا اور بیلٹ بدلتے رہتے۔ اس کا دماغ ایک بہت بڑا وسیع ورک شاپ ہو گیا تھا، جہاں شور ہو رہا تھا۔ مشینیں چل رہی تھیں۔ شور ہو رہا تھا۔

پھر کمزوری اور بھوک نے اسے نڈھال کر دیا۔ پھر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ پھر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ پھر وہ جاگ گیا۔ اس کی تھوڑی دیر بعد پھر اس پر نیند کا غلبہ ہو گیا یوں ہی کبھی وہ نیند پر کبھی نیند اس پر فتح پاتی رہی۔ اور آدھا دن اور آدھی رات گزر گئی۔ پھر بہت دیر تک نیند اور بیداری میں جنگ ہوتی رہی جیسے دو تگڑے بھینسے لڑ رہے ہوں۔ سر سے سر اور سینگ سے سینگ بھڑائے کبھی ایک

دوسرے کو ڈھکیلتے ہوئے بہت دور لے جاتا۔ کبھی دوسرا پہلے کو ٹھیلتا ہوا پھر اسی جگہ پہنچا دیتا اور نیند یوں بالآخر نیند نے فتح پالی۔ بیداری پسپا ہو کر گر پڑی اور نیند حاوی ہو گئی۔

پھر صبح ہو گئی۔ صبح کاذب طلوع ہو گئی اور سارے ماحول پر سپیدۂ سحر بکھر گیا۔ سامنے والی سنسان نل پر اور سڑک پر اور مشرقی گرجا کی پیشانی پر سپیدۂ سحر جھک آیا۔

پھر مائیکل کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کار کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ صبح ہو چکی ہے اور نور کا تڑکا پگھلی ہوئی چاندی کی طرح سارے ماحول پر چھا گیا ہے اور خاموش نل کے گلے سے گھر گھراہٹ پیدا ہو گئی ہے اور اس سے ذرا ہٹ کر اندھے لیمپ کے نیچے کا ایک کتا صبح کے دھندلکے میں لپک لپک کر منہ سے اپنی دم کو نوچ رہا ہے کبھی دائیں کبھی بائیں۔ لپک لپک کر مائیکل دیکھتا رہا۔ کھویا کھویا سا مبہوت سا۔ اس کی تمام حسیات بیدار ہو کر صرف بصارت میں مرکوز ہو گئی تھی اور تل چٹے اس کی قمیض کے اندر سراتے رہے اور سنسان تار پر چڑیا پھدکتی رہی اور وہ دیکھتا رہا۔

کتا بدستور جھپٹ جھپٹ کر کبھی دائیں سے بائیں، کبھی بائیں سے دائیں اپنی دم کو نوچتا رہا۔ جیسے کوئی بھوری مکھی اسے مسلسل تنگ کر رہی ہو..... مسلسل تنگ کر رہی ہو.....!

OO

"..... تن تنہا کسی ویرانے میں کھڑے ہو کر زندگی گزارنے سے
زیادہ کڑی سزائیں بھی ہوں گی.....؟"

"..... الفاظ اسے فریب دے رہے تھے۔
"یا وہ سوال ہی الفاظ کی گرفت سے باہر تھا
یا وہ سوال الفاظ سے شرما رہا تھا....."

"..... صفر سے آگے صفر اور
اے تلاش کرنے والے دیواروں سے ٹکرا کر
کیا پائے گا، دیواریں کیا ہیں؟"

بابا لوگ

(افسانے)

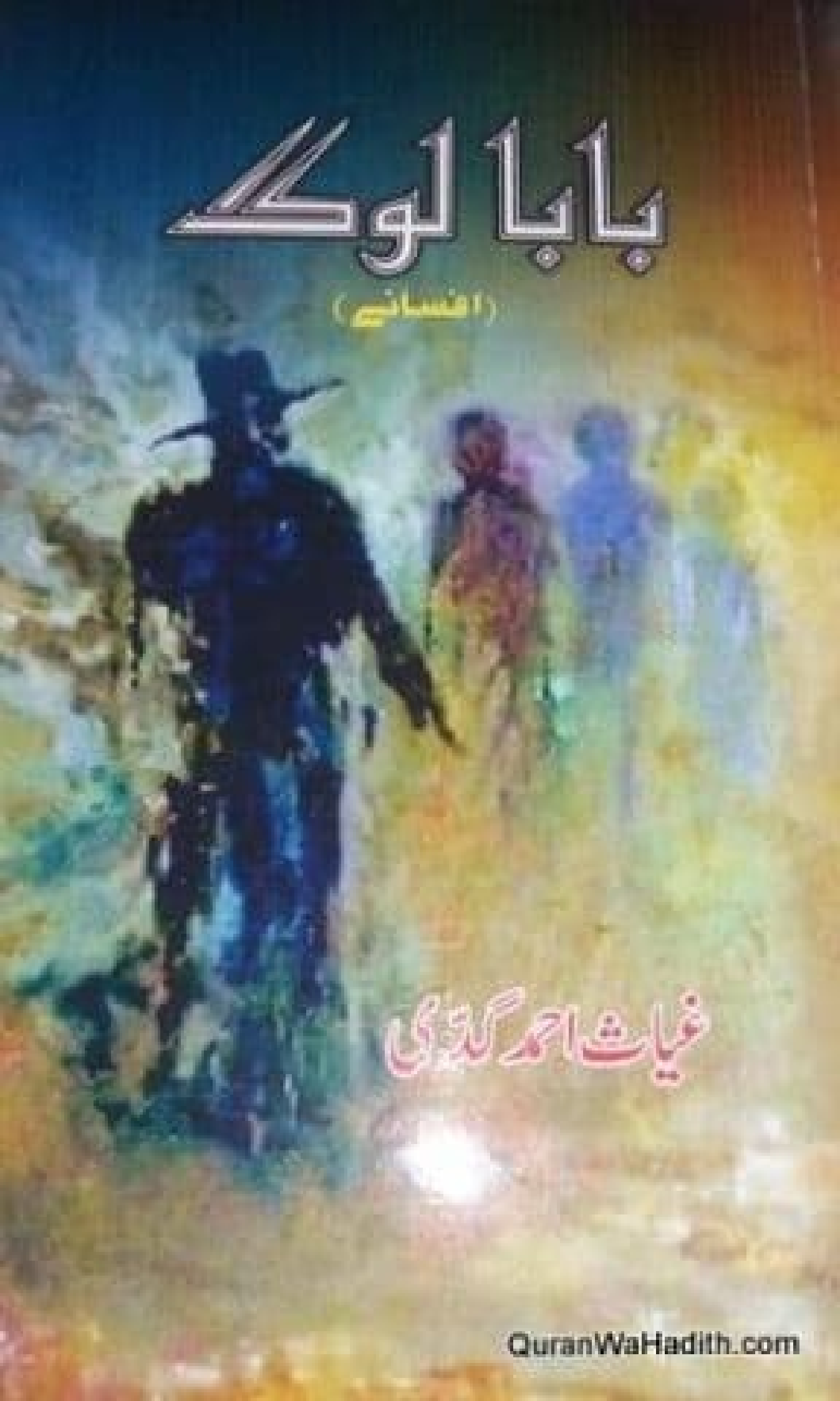

غیاث احمد گدی

QuranWaHadith.com